جون
۲۰۰۲

موسس
سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ
ترجمان القرآن

مدیر
پروفیسر خورشید احمد

ادارہ ترجمان القرآن

ماہنامہ ترجمان القرآن

جلد۱۲۹' عدد۶' ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ' جون ۲۰۰۲ء

○ اشارات

ریفرنڈم کے بعد:

''اصلاحات'' کا تسلسل یا اصلاح احوال — پروفیسر خورشید احمد — ۳

○ حکمت مودودیؒ

ہدایت وضلالت — ۱۹

○ فہم قرآن

اہل تقویٰ کے اوصاف — ڈاکٹر محمد بلال خان — ۲۳

○ فقہ واجتہاد

مختلف مسالک پر عمل — مولانا عبدالمالک — ۳۵

○ دعوت وتحریک

سیاسی اسلام؟ — علامہ یوسف القرضاوی — ۴۳

○ اسلام اور مغرب

مغرب اور اسلام میں مکالمہ — پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد — ۵۱

○ مطالعہ کتاب

امریکہ میں اسلام کا مستقبل — ڈاکٹر عصام العریان — ۶۳

○ اخبار اُمت

گجرات میں مسلم کشی — پروفیسر خورشید احمد — ۶۷

مصر انقلاب کے دوراہے پر — جینوی عبدد — ۷۰

○ رسائل ومسائل — ۷۳

○ کتاب نما — ۷۹

○ مدیر کے نام — ۸۵

مدیر

پروفیسر خورشید احمد

نائب مدیر

مسلم سجاد

منصورہ' ملتان روڈ' لاہور

فون: ۵۴۲۵۳۵۶ (۰۴۲)

فیکس: ۷۸۳۲۱۹۴ (۰۴۲)

E-mail: tarjuman@wol.net.pk

مدیر انتظامی

عبدالکریم

۵-اے' ذیلدار پارک' اچھرہ' لاہور

فون: ۷۵۸۷۹۱۶ (۰۴۲)

فیکس: ۷۵۸۵۵۹۰ (۰۴۲)

E-mail: tarjuman@pol.com.pk

www.tarjumanulquran.org

قیمت فی شمارہ: ۲۰ روپے

زرسالانہ: ۲۰۰ روپے

تاحیات: ۳۰۰۰ روپے

بنگلہ دیش' ایران' بھارت: ۶۰۰ روپے

یورپ' مشرق وسطیٰ' مشرق بعید' افریقہ: ۹۰۰ روپے

امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا: ۱۲۰۰ روپے

زیراہتمام: البلاغ ٹرسٹ

علمی تحقیق، دعوت عام

علمی تحقیق کا شعبہ دراصل ہماری تحریک کا دل اور دماغ ہوگا۔ اب تک اس تحریک کا علمی کام تنہا میں ہی کرتا رہا ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایک اکیلا آدمی ایسی ایک ہمہ گیر و عالمگیر تحریک کے لیے علمی و فکری بنیاد فراہم کرنے کی خدمت انجام نہیں دے سکتا۔ اگر ہمیں واقعی نظامِ تمدن و اخلاق میں کوئی انقلاب برپا کرنا ہے تو ہمارے لیے ناگزیر ہے کہ صرف اُردو زبان ہی میں نہیں بلکہ متعدد دوسری زبانوں اور خصوصاً دو تین بین الاقوامی زبانوں میں بھی ایسا لٹریچر فراہم کریں جو اسلامی نظام کی پوری شکل و صورت سے دنیا کو آشنا کرے، اور اپنی تنقید سے موجودہ تہذیب و تمدن کی جڑیں اکھاڑ کر دلوں اور دماغوں میں نظامِ اسلامی کی صداقت کا یقین اور اس کے قیام کی خواہش پیدا کردے۔ نیز ہمیں قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ اسلام کے متعلق جملہ علوم کی تدوین جدید کرنی ہوگی، اور اسی طرح علومِ جدیدہ کو بھی اسلامی نقطۂ نظر سے ازسرنو مدون کرنا ہوگا۔ یہ کام کیے بغیر ہم ہرگز یہ توقع نہیں کرسکتے کہ مجرد کسی عمومی یا عسکری تحریک سے کوئی حقیقی اسلامی انقلاب دنیا کے موجودہ نظامِ تمدن و اخلاق میں رونما ہوجائے گا۔

ہماری تعمیری کوششیں بے سود ہوجائیں گی اگر ساتھ ساتھ ان کی پشت پر ایک مضبوط رائے عام بھی تیار نہ ہوتی رہے۔ جس طرح مذکورۂ بالا تعمیری کاموں کے بغیر کوئی اسلامی انقلاب رونما نہیں ہوسکتا اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ عامتہ الناس میں اسلام کی دعوت پھیلائے بغیر ایسا کوئی انقلاب برپا ہوسکے۔ ہمیں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ حتی الامکان دنیا کے گوشے گوشے میں اپنی آواز پہنچانی ہوگی۔ کیونکہ آج کسی ایک ملک میں کوئی حقیقی انقلاب واقع نہیں ہوسکتا جب تک کہ وسیع پیمانہ پر بین الاقوامی رائے عام اس کی تائید میں تیار نہ کرلی جائے۔ اربوں انسانوں کو ہمارے پیغام سے واقف ہونا چاہیے، کروڑوں انسانوں کو کم از کم اس حد تک اس سے متاثر ہوجانا چاہیے کہ وہ اُس چیز کو حق مان لیں جس کے لیے ہم اُٹھ رہے ہیں، لاکھوں انسانوں کو ہماری پشت پر اخلاقی اور عملی تائید کے لیے آمادہ ہونا چاہیے، اور ایک کثیر تعداد ایسے سرفروشوں کی تیار ہونی چاہیے جو بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اس مقصدِ عظیم کے لیے کوئی خطرہ، کوئی نقصان، کوئی مصیبت برداشت کرنے میں تامل نہ کریں۔ (''اشارات''، ابوالاعلیٰ مودودی، ماہنامہ ترجمان القرآن، جلد۲۰، عدد۴، ربیع الآخر ۱۳۶۱ھ، جون ۱۹۴۲ء، ص ۲۱۳-۲۱۵)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ریفرنڈم کے بعد ——

''اصلاحات'' کا تسلسل یا اصلاح احوال

پروفیسر خورشید احمد

انسان اپنے منصوبے بناتا ہے اور اللہ تعالیٰ جو اصل حاکم اور کارفرما ہے اپنی تدبیر کرتا ہے اور بالآخر ہوتا وہی ہے جو مشیت الٰہی کا تقاضا اور رضاے الٰہی کا مطلوب ہوتا ہے (وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ ط وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ' وہ اپنی تدبیریں کرنے لگے اور اللہ نے اپنی تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔ اٰل عمرٰن ۳:۵۴)۔ اور یہی وجہ ہے کہ بارہا انسان کو ایک چیز بری لگتی ہے لیکن بالآخر اس کے نتائج اور ثمرات کچھ دوسرے ہی نکلتے ہیں۔ ایک چیز کو وہ بہت شوق اور اہتمام سے کرتا ہے مگر اس کے نتیجے میں نقصان اور ہزیمت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ (وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ج وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ط وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ' ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں ناگوار ہو اور وہی تمھارے لیے بہتر ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمھیں پسند ہو اور وہی تمھارے لیے بری ہو--- اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔ البقرہ ۲:۲۱۶)

بصیرت کی نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حالیہ ریفرنڈم میں بھی قضا و قدر کے ایک ایسے ہی قاعدے کی کارفرمائی تھی۔ جنرل پرویز مشرف جن کو ۱۲ اکتوبر ۱۹۹۹ء کو تقریباً پوری قوم کی تائید حاصل تھی اور ایک ناگوار عمل (فوجی مداخلت) کو اصلاحِ احوال کی ایک اُمید کی بنیاد پر تمام دینی اور سیاسی قوتوں نے' باستثناے چند' اس لیے قبول کیا تھا کہ غیر جانب دار احتساب کے ذریعے ملک کو لوٹنے والوں کو کیفر کردار تک پہنچایا جاسکے گا اور جلد از جلد ملک میں آزاد انتخابات کے ذریعے ایک نئی اور امانت دار قیادت اُبھر سکے گی' لیکن اس قومی ایجنڈے پر

عمل کرنے کے بجائے انھوں نے اپنا ہی ایک ایجنڈا تصنیف فرما ڈالا۔ احتساب کو ایک مذاق اور التفات و انتقام کا آلہ بنا ڈالا۔ ملک کی نظریاتی بنیادوں کو کمزور اور مجروح کرنے والی سازشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ فوج میں اکھاڑ پچھاڑ اور سیاست میں "ہم خیالوں" اور "شاہ پرستوں" کا کھیل شروع کر دیا۔ بھارت سے پینگیں بڑھانے اور امریکہ کے عالمی کھیل میں ایک بے جان مہرہ بن جانے تک پر آمادہ ہو گئے اور بالآخر امریکہ کو کندھا دے کر افغانستان کے معصوم انسانوں کے خون ناحق کی ذمہ داری بھی اپنے شانوں پر لے لی۔

ریفرنڈم سے جنرل پرویز مشرف کے دو مقاصد تھے' ایک وہ سند جواز (legitimacy) حاصل کرنا جو اقتدار پر قابض ہونے کے باوجود ان کو حاصل نہیں اور دوسرے اپنے اقتدار کی مدت کو طول دینا کہ سپریم کورٹ کی عطا کردہ تین سال کی مہلت اب ختم ہو رہی ہے اور ان کو ملک کے نظام کی تشکیل نو اور اپنی "اصلاحات" کے تسلسل اور تکمیل کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ لیکن ریفرنڈم جس طرح منعقد کیا گیا' اس سے ان کی سند جواز مزید مشتبہ ہو گئی اور انھیں اپنی پالیسیوں کے تسلسل کے لیے کوئی مینڈیٹ حاصل نہ ہوا۔ پاکستانی عوام نے بچشم سر دیکھا اور ساری دنیا کو ملکی اور عالمی میڈیا نے بتایا کہ بوگس ریفرنڈم ایک تاریخی دھاندلی تھا' محض ایک ڈھونگ جس نے صدر مشرف کو درحقیقت کمزور کر دیا ہے۔ انھوں نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری ہے۔

تاریخ اور سپریم کورٹ نے جو موقع موجودہ قیادت کو دیا تھا اس نے اس کا فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس کی ۳۰ ماہ کی کارکردگی بحیثیت مجموعی بے حد مایوس کن ہے۔ اپنی ناکامیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے اس نے "اصلاحات کے تسلسل" کا افسانہ تراشا اور ریفرنڈم کو اس کا ذریعہ بنانے کی کوشش کی۔ ریفرنڈم میں تو وہ ناکام رہی لیکن اصلاحات اور ان کے تسلسل کی باتیں ابھی ہو رہی ہیں اور اس کے لیے سیاسی جوڑ توڑ اور صف بندی کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ "اصلاحات" اور ان کے "تسلسل" کے وعدوں کا بھی بے لاگ جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ جنرل پرویز مشرف اور ان کی ٹیم نے ملک کو کیا دیا ہے اور کس چیز سے محروم کیا ہے۔

پالیسیوں میں تسلسل کے نام پر جس طرح ایک شخص کو محور بنایا جا رہا ہے اور اس کی مدت اقتدار کو ان کے مدار مہام کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے' یہ بات ہی سرے سے غلط ہے۔ ہر انسان فانی ہے اور فانی انسانوں پر کسی تسلسل کا اہتمام نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تار عنکبوت سے بھی زیادہ بودا سہارا ہے۔

اگر پالیسیوں کے تسلسل کے لیے کسی خاص فرد پر انحصار ضروری ہوتا تو پھر نظام حکومت میں وقت کے تعین سے عہدوں کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر پارلیمنٹ چند سال کے لیے کیوں ہو؟ پھر صدر مملکت کے

لیے ایک یا دو مدت کی حد کیوں رکھی جائے؟ پھر فوج کے سربراہ کے لیے تین سال کی مدت کیوں رکھی جائے؟ پھر ایک خاص مدت کے بعد اہم عہدوں پر فائز افراد کا تبادلہ کیوں ہو؟ تسلسل کا جو تصور آج پیش کیا جا رہا ہے' یہ آمریت کی راہ ہموار کرنے والا ہے۔ اسے اسلام یا جمہوریت کے معروف اصولوں سے کوئی علاقہ نہیں اور نہ یہ عقل اور تجربے سے مطابقت رکھتا ہے۔

جنرل صاحب نے ریفرنڈم کی مہم میں اپنے ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۹ء کے سات نکاتی ایجنڈے کو مرکزی اہمیت دی ہے اور اپنی اصلاحات اور کارناموں کا ذکر بڑے دعوے کے ساتھ کیا ہے۔ ہم صرف ان کے مرکزی نوعیت کے وعدوں کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جن کو جاری رکھنے کے لیے وہ حاصل شدہ تین سالوں پر فی الحال مزید پانچ سال کا اضافہ چاہتے ہیں۔

امن و امان کی مخدوش صورت حال

سب سے پہلی چیز امن و امان اور جان و مال اور آبرو کے تحفظ کا مسئلہ ہے' یہ ہر حکومت کا اولیں فرض ہے لیکن فوجی حکومت کا تو سب سے مضبوط یا سب سے کمزور پہلو امن و امان کے باب میں اس کا ریکارڈ ہے۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آج ایک عام پاکستانی اور پاکستان میں آنے والا ہر غیر ملکی اپنے کو جتنا غیر محفوظ پاتا ہے' پہلے کبھی ایسا نہیں تھا۔ لا اینڈ آرڈر کی حالت ماقبل کے ادوار میں بھی مخدوش رہی لیکن فوجی حکومت نہ صرف حالات کو بہتر نہیں کر سکی بلکہ اس کے دور میں لاقانونیت میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

صرف چند حقائق صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کرنے کے لیے قابل غور ہیں۔

کراچی میں لاقانونیت کس انتہا کو پہنچ چکی ہے' ۸ مئی ۲۰۰۲ء کا واقعہ جس میں ۱۴ افراد ہلاک ہوئے اور جس کے نتیجے میں پاکستان نیوی کا ایک اہم دفاعی منصوبہ التوا کا شکار ہو گیا ہے' اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ڈینیل پرل کا واقعہ کراچی میں اور اسلام آباد میں سفارتی علاقے میں چرچ پر حملہ ساری دنیا میں پاکستان کا منہ کالا کرنے کا باعث ہوئے ہیں۔ کراچی میں پچھلے چند سال میں ۱۸۲ افراد کو فرقہ وارانہ رنگ دے کر قتل کیا گیا ہے اور جن ۲۹۸ افراد کو شبہے میں گرفتار کیا گیا ان میں سے صرف دو کو سزا ہوئی ہے' باقی سارے کیس معما بنے ہوئے ہیں۔ ۹۰ ڈاکٹروں کو شہید کیا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر احتجاج میں ہڑتال کر رہے ہیں اور امریکہ میں پاکستانی ڈاکٹر تفتیش کے سارے اخراجات برداشت کرنے کو تیار ہیں مگر نہ کوئی مجرم پکڑا جاتا ہے اور نہ یہ سلسلہ بند ہوتا ہے۔ سندھ میں سالانہ ۱۰۰ افراد اغوا کیے جا رہے ہیں اور بڑے بڑے زمین دار اس کی پشت پر ہیں لیکن قانون کا ہاتھ کسی کو گرفت میں نہیں لے پاتا۔

ایک جائزے کے مطابق اکتوبر ۱۹۹۹ء سے وسط ۲۰۰۱ء تک ملک میں ۱۲۷ دہشت گردی کے واقعات

ہوئے ہیں جن میں ۴۵۷ افراد جاں بحق ہوئے مگر نام نہاد مقابلے میں چند افراد کے مارے جانے کے سوا کوئی مجرم نہیں پکڑا گیا۔ پنجاب میں ایک مطالعے کے مطابق ہر ڈیڑھ منٹ میں اوسطاً ایک جرم واقع ہو رہا ہے۔ ہر ایک گھنٹے اور ۴۳ منٹ کے بعد ایک قتل کا واقعہ رونما ہو رہا ہے اور ۲۰۰۰ء میں ۴ ہزار ۳ سو ۲۹ کے مقابلے میں ۲۰۰۱ء میں ۴ ہزار ۶ سو ۱۳ جرائم وقوع پذیر ہوئے۔ اقدامات قتل بھی ۵ ہزار ۶ سو ۳۳ کے مقابلے میں ۵ ہزار ۶ سو ۴۹ ہوئے ہیں۔ ہر ۲۶ منٹ میں ایک شخص پر حملہ ہوا ہے جس میں وہ مجروح ہوا ہے۔ ہر آٹھ گھنٹے میں ایک سرکاری ملازم پر حملہ ہوا ہے اور ہر چار گھنٹے میں ایک خاتون کی عصمت لوٹی گئی ہے۔ اغوا کی واردات ہر ۴۵ منٹ پر واقع ہوئی اور ہر گھنٹے بعد ایک ڈاکا پڑا ہے۔(ہفت روزہ انڈی پنڈنٹ' ۲۶ دسمبر ۲۰۰۱ء' ص ۳)

یہ ہے ملک کے سب سے بڑے صوبے کی صورت حال۔ لاہور میں روزانہ سات اور کراچی میں ۲۴ گاڑیاں چھینی جارہی ہیں۔ کراچی میں صرف ایک سال میں ایک ہزار گاڑیاں اٹھائی گئیں۔ پولیس جو قانون کو نافذ کرنے والی اور عوام کی محافظ ہے جرائم کی سرپرست ہی نہیں خود ان کا ارتکاب کرنے میں مصروف ہے۔ سرکاری اعداد و شمار ایک ہوش ربا صورت حال کا پتا دیتے ہیں اور حکمران ہیں کہ لا اینڈ آرڈر پر قابو پالینے کے دعوے کر رہے ہیں۔(انڈی پنڈنٹ' ۵ دسمبر ۲۰۰۱' ص ۱۰)

پنجاب پولیس کی کارکردگی کی جو رپورٹ انڈی پنڈنٹ میں شائع ہوئی ہے اس کی رو سے پنجاب پولیس کے کل عملے کا ۳۵ فی صد اور لاہور ڈسٹرکٹ پولیس کا ۴۱ فی صد بدعنوانی اور جرائم کا مرتکب ہے۔ ۲۰۰۱ء کے پہلے نو مہینے میں پنجاب پولیس کی ۹۸ ہزار نفری میں سے ۳۴ ہزار ۵ سو ایک کسی نہ کسی جرم یا بدعنوانی کے مرتکب رہے ہیں اور لاہور پولیس کی ۱۶ ہزار نفری میں سے ۶ ہزار ۵ سو ۴۱ کو کسی نہ کسی جرم میں سزا دی گئی ہے۔ معاملہ محض نیچے کے عملے کا نہیں۔ جرم کا ارتکاب کرنے والوں مین چار ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس' ۸۲۸ انسپکٹر' ۲ ہزار ۷ سو ۲۳ سب انسپکٹر' ۳ ہزار ۸ سو ۳۷ اسسٹنٹ سب انسپکٹر' ایک ہزار ۷ سو ۵۰ ہیڈ کانسٹیبل اور ۲۵ ہزار ۳ سو ۲۳ کانسٹیبل شامل تھے۔ یہ وہ افراد ہیں جن کی گرفت ہوسکی--- قیاس کن زگلستان من بہار مرا!

پھر اگر امن وامان کا وہ حال نہ ہو جو ہے تو کیا ہو۔ پولیس اصلاحات کی بڑی باتیں ہو رہی ہیں لیکن جو کچھ سامنے آرہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ظالم اور کرپٹ پولیس کے اختیارات میں اضافہ ہو رہا ہے اور توازن کا جو نظام بصورت پبلک سیفٹی کمیشن تجویز کیا جا رہا ہے وہ اول تو وجود میں نہیں آرہا' اس کے اختیارات محدود ہیں اور پھر اطلاعات ہیں کہ جہاں کہیں وہ بنائے جارہے ہیں ان کے لیے جو نام آرہے ہیں ان میں بڑی تعداد خود مجرموں کی ہے(دی نیوز' ۱۲ مئی ۲۰۰۲ء)

جیلوں کا حال ناگفتہ بہ ہے۔ نوجوانوں کی بڑی تعداد جس طرح جرم کی طرف جارہی ہے اور بحیثیت

مجموعی ملک میں قانون کا احترام جس طرح ختم ہو رہا ہے وہ ہولناک ہے۔ جب دستور اور قانون کا حلف اٹھانے والے اور ان کے نفاذ کے ذمہ داران ہی ان کا احترام نہیں کرتے تو معاشرہ تباہ حال نہ ہو تو کیا ہو۔

کراچی میں فرقہ وارانہ ہلاکتوں کی تفصیل نیوز لائن (مئی ۲۰۰۲ء) نے دی ہے جس سے گذشتہ پانچ سال' خصوصیت سے پچھلے تین سال میں قانون کی گرفت کے ڈھیلے ہونے اور خون مسلم کی ارزانی میں اضافے کی تصویر سامنے آتی ہے: ۱۹۹۸ء میں ۵' ۱۹۹۹ء میں ۱۲' ۲۰۰۰ء میں ۱۸' ۲۰۰۱ء میں ۵۸' ۲۰۰۲ء (جنوری/اپریل) میں ۲۲۔

لاہور جیسے شہر میں خود فوج کے زیر ملازمت اور ریٹائرڈ ارکان پر حملوں کی رپورٹ امن وامان کی مخدوش صورت حال کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ۲۰۰۱ء کے پہلے ۱۰ مہینوں میں صرف لاہور میں ۳۰ فوجی نشانہ بنے جن میں جنرل' بریگیڈیئر' کرنل اور میجر کے درجے کے افسران شامل ہیں۔ (انڈی پنڈنٹ ۲۱ نومبر ۲۰۰۱ء' ص ۴)

لیکن اس سلسلے کی سب سے ہولناک اور ہوش ربا صورت حال' حال ہی میں شائع ہونے والی ساؤتھ ایشیا پارٹنرشپ انٹرنیشنل (SAPI) کی رپورٹ ہے جس میں پاکستان سمیت کئی ممالک میں بچوں سے زیادتی کی تفصیل پیش کی گئی ہے اور اس کی رو سے ۲۰۰۰ء میں ۱۹۹۹ء کے مقابلے میں پاکستان میں بچوں سے جنسی زیادتی کے واقعات میں ۳۹ فی صد کا اضافہ ہوا ہے' یعنی ۹۴۵ کے مقابلے میں ایک ہزار ۳ سو ۱۷۔ ان ظلم کا نشانہ بننے والوں میں سے ۶۰ فی صد لڑکیاں ہیں۔ رپورٹ کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ رپورٹ کیے جانے والے واقعات اصل واقعات کا صرف ۱۰ فی صد ہیں۔

اگر فوجی حکومت کے دور میں امن وامان اور جان ومال اور عزت وآبرو کے تحفظ کا یہ حال ہے تو اس پر جنرل پرویز مشرف اور جنرل معین حیدر کو شرمسار ہونا چاہیے نہ کہ اسے کارکردگی اور کارنامے کی فہرست میں کوئی جگہ دی جائے۔

نیب کی کارگزاری

اس حکومت کا دوسرا ''کارنامہ'' احتساب کا نظام ہے۔ آیئے اس کی کارکردگی کا بھی مختصر جائزہ لیں۔

نیشنل اکاونٹیبلٹی بیورو' نیب (National Accountability Bureau) کو گذشتہ ۳۰ ماہ میں تین سربراہان کی قیادت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ یہاں تسلسل کے اصول کی ضرورت محسوس کی گئی اور نہ پالیسی کے اصولوں کی۔ پہلے دعویٰ تھا کہ احتساب بلاتخصیص ہوگا۔ پھر جرنیلوں اور ججوں کو دائرے سے باہر رکھنے کا اعلان ہوا مگر جب اس پر ہر طرف سے واویلا مچا تو اشک شوئی کے لیے ان کو بھی دائرے میں رکھ

لیا گیا۔

بیورو کی جو رپورٹ خود اس نے شائع کی ہے اس کی رو سے ادارے نے ایک ہزار ۴۳ کیس تحقیق کے لیے وصول کیے۔ ان ۳۰ ماہ میں صرف ۲۸۷ معاملات کی تفتیش مکمل ہو سکی ہے۔ گویا صرف ۲۷.۵ فی صد باقی ۶۶ فی صد ابھی زیر تفتیش ہیں۔ سیاست دانوں میں دو سابق وزرائے اعظم' ۱۳ وزرائے اعلیٰ' ۶۲ ارکان قومی اسمبلی اور ۱۰ اسینیٹ کے ارکان ہیں اور ۱۰۸ کا تعلق صوبائی اسمبلیوں سے ہے۔ مسلم لیگ (ن) اور پیپلز پارٹی سے تعلق رکھنے والوں کی تعداد تقریباً دو تہائی اور ایک تہائی ہے۔

جن مقدمات کی تفتیش کی گئی ہے ان میں سے ۸۷ سے سودے بازی کے بعد مک مکا ہو چکا ہے اور روایت یہ ہے کہ اس حربے کو سیاست دانوں کو "ہم خیال" بنانے کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اگر ایسا نہ بھی ہو' جب بھی یہ احتساب کے اصول کے خلاف ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بڑا معما یہ ہے کہ خود میاں نواز شریف صاحب پر سارے دعووں اور مواد کی موجودگی کے باوجود مالی بدعنوانی اور قوم کو لوٹنے کے الزام پر مقدمہ نہیں چلایا گیا' بلکہ جہاز ہائی جیک کرنے اور ہیلی کاپٹر کے معاملات پر مقدمہ چلا اور پھر اس قدر سنگین بدعنوانیوں اور الزامات کے باوجود ان سے معاملات طے کر کے باہر بھیج دیا گیا۔ دونوں سابق وزرائے اعظم اور ان کے اہل خاندان کے علاوہ یہی کچھ بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ کیا جا رہا ہے اور سیاسی تجزیہ نگار صاف کہہ رہے ہیں کہ:

> نیب کے سیاست زدہ ہونے کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ حکمران نیب کو اپنے سیاسی مخالفین سے سمجھوتہ کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ جس طرح کچھ بہت ہی بدنام کرپٹ سیاست دانوں کو احتساب سے باہر رکھا گیا ہے' اس سے نیب کی انصاف پسندی پر شبہات وارد ہوتے ہیں۔

یہ بھی ایک معما ہے کہ گو نیب کا دعویٰ ہے کہ اس نے اب تک ۷.۵۹۶ ارب روپے کی بازیافت (recovery) کی ہے۔ لیکن سرکاری خزانے کو جو رقم عملاً منتقل کی گئی ہے وہ صرف ۱.۲ ارب روپے ہے' یعنی اکاؤنٹنٹ جنرل آف پاکستان نے صرف یہ رقم وصول کی ہے:

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا

نیب کی کارکردگی اور غیر جانب داری پر ایک بڑا دھباوہ خط ہے جو اس کے سابق چیئرمین جنرل خالد مقبول نے اپنے نیب سے رخصت ہونے سے پہلے تین سروس چیفس کو لکھا تھا اور ایرفورس کے دو سابق

سربراہوں اور فوج کے ایک سابق سربراہ کے دور میں ہونے والی سنگین بدعنوانیوں کی تحقیق کی اجازت چاہی تھی لیکن یہ اجازت نہ جنرل خالد مقبول کو ملی اور نہ ان کے جانشین کو (انڈی پنڈنٹ' ۹ اگست ۲۰۰۱ء ص ۱)

جنرل پرویز مشرف کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے اوپر کی سطح سے کرپشن ختم کر دی ہے۔ بظاہر ان کے وزرا کے بارے میں اس قسم کی چہ میگوئیاں نہیں ہو رہیں جو ماضی کی حکومتوں کے بارے میں ہوتی تھیں۔ لیکن ایک تو کرپشن صرف مالی سودوں اور کک بیکس کا نام نہیں' وسائل کا غلط استعمال جس شکل میں بھی ہو وہ کرپشن کے زمرے میں آتا ہے اور جو کچھ ریفرنڈم میں ہوا اسے کسی اور نام سے پکارا جانا ممکن نہیں۔ پھر بین الاقوامی سطح پر کرپشن کے ادراک کا جو نظام بھی ہے اس میں پاکستان کے مقام اور حیثیت میں نہ صرف یہ کہ کوئی بہتری نہیں آئی ہے بلکہ تازہ ترین رپورٹ جو ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل نے شائع کی ہے اس میں کرپشن کے اشاریے میں اضافہ آیا ہے۔ ۱۹۹۸ء کے اشاریے کی رو سے نیچے سے ہمارا نمبر ۱۱ تھا اور ۱۰ کے اسکیل میں ہمارا اسکور ۲.۷ تھا لیکن ۲۰۰۱ء کی رپورٹ میں نیچے سے اب ہمارا شمار صرف سات پر ہے اور اسکور بھی اور نیچے آ گیا ہے' یعنی ۲.۳۔

انفرادی واقعات کے بیان سے ہم نے ہمیشہ گریز کیا ہے لیکن صرف تذکیر اور انتباہ کے لیے عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اخبارات میں ۲۸ ججوں کی فہرست آئی ہے جن کا تعلق سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ سے ہے۔ ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ حلف نامہ دے کر انھوں نے ایک یا ایک سے زیادہ پلاٹ بلا استحقاق حاصل کیے ہیں (انڈی پنڈنٹ' ۲۴ دسمبر ۲۰۰۱ء ص ۲۴)۔ لیکن احتساب کے نظام کو کوئی جنبش نہیں ہوئی۔

دی ہیرالڈ اور دوسرے رسائل نے موجودہ حکومت کے دور میں ایمپلائز اولڈ ایج بینیفٹ کے ادارے میں ۱.۴ ارب روپے کے خرد برد کی رپورٹیں شائع کی ہیں جو پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کی ۳۱ جنوری ۲۰۰۲ء کی میٹنگ میں سامنے آئی ہیں۔ قومی تعمیر نو بیورو کے چیئرمین اس نظام کا دماغ کہے جاتے ہیں' ان کے ایک کزن کموڈور سید طیب نقوی (چیئرمین کراچی فشریز ہاربر اتھارٹی کے) بارے میں لاکھوں کروڑوں کی کرپشن کی شکایات حکومت سندھ کو دی گئی ہیں۔ اطلاع ہے کہ ان کے ہٹائے جانے کے احکام خود چیف ایگزیکٹو کی طرف سے جاری ہوئے مگر ان پر عمل روک دیا گیا (انڈی پنڈنٹ' ۳۰ اپریل' ۲۰۰۲ء ص ۴)۔ اور حال ہی میں پبلک اکاؤنٹس کمیٹی میں نارکوٹکس بورڈ کے سربراہان کے جو وزرائے داخلہ ہوتے ہیں' وہاں کی گاڑیوں کے ناجائز استعمال کی رپورٹیں آئی ہیں اور اس میں سابقہ وزرائے داخلہ کے ساتھ موجودہ وزیر داخلہ کا نام بھی آتا ہے (دی نیشن' ۶ مئی ۲۰۰۲ء)۔

محکمہ خوراک میں کرپشن کے جو واقعات ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء کے مالی سال کے بارے میں سامنے آ رہے

ہیں وہ ۳ ارب ۲ کروڑ روپے سے متجاوز ہیں۔ وزارت سیاحت میں ۹ کروڑ کے حسابات غائب ہیں (نوائے وقت' ۳۱ مئی ۲۰۰۲ء)۔ ادویات کی خرید میں ۹۱ کروڑ کی گڑبڑ کی بات بھی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے سامنے آئی ہے (دی نیشن' ۸ مئی ۲۰۰۲ء)۔

تقرریوں میں بھی من مانی کا اسی طرح رواج ہے حتیٰ کہ فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے سابق ارکان کو جو قانوناً اپنی ریٹائرمنٹ کے بعد حکومت میں کوئی تنخواہ والا کام نہیں کر سکتے' دھڑا دھڑ نوازا جا رہا ہے (دی نیوز' ۷ مئی ۲۰۰۲ء)۔ اس سال کی ورلڈ بنک کی کمیٹی نے جو رپورٹ مئی ۲۰۰۲ء میں دی ہے اور جسے بی بی سی نے سیربین کے پروگرام میں ۱۲ مئی ۲۰۰۲ء کو نشر کیا ہے اس کے مطابق پاکستان میں تین سرکاری ادارے کرپشن کا گڑھ ہیں' یعنی سی بی آر' واپڈا اور کے ای ایس سی۔ اس سے پہلے خود وزارتِ خزانہ کی ٹیکس نظام میں اصلاحات کی ٹاسک فورس نے (ورلڈ بنک کے سابق نائب صدر شاہد حسین صاحب کی سربراہی میں) اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ سی بی آر' پولیس' ماتحت عدالتیں اور واپڈا کرپشن میں سب سے پیش پیش ہیں۔ اس کے باوجود بھی اگر جنرل صاحب کا دعویٰ ہے کہ کرپشن کا خاتمہ ہو گیا ہے تو "ناطقہ سربگریباں ہے' اسے کیا کہیے"۔

وفاقیت کا اصول

جنرل صاحب نے وفاقی نظام کے استحکام اور صوبوں کے درمیان ہم آہنگی کی بات بھی کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ فوجی حکومت اور وفاقیت کا اصول ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ فوجی حکومت کے معنی ہی وحدت اختیار (unity of command) ہے۔ صوبے اپنی تمام خودمختاری سے محروم ہو جاتے ہیں اور صرف ایک شخص کی پالیسی ہر جگہ نافذ ہوتی ہے۔ پاکستان میں وفاقیت کے اصول کو جتنا نقصان فوجی ادوار میں پہنچا ہے اس کا شمار بھی مشکل ہے۔ فوجی اقتدار کے ۲۶ سال وفاق کے لیے سب سے تاریک سال رہے ہیں۔ لیپاپوتی اپنی جگہ لیکن آج بھی حقیقت ہے کہ مسئلہ پانی کی تقسیم کا ہو یا مالی وسائل میں شرکت کا' قرضوں کی بات ہو یا ان پر وصول کیے جانے والے سود کی' زمین کی تقسیم کی بات ہو یا ترقیاتی پروگراموں اور غربت مٹانے کے منصوبوں کے لیے وسائل کی فراہمی کی' چھوٹے صوبوں کی شکایات اس مقام پر پہنچ گئی ہیں کہ پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک سرکاری اتھارٹی سے جو صدیوں سے سرکاری ملازمین پر مشتمل ہے چھوٹے صوبوں کے نمایندوں نے واک آؤٹ کیا اور صدر کو مداخلت کرنا پڑی۔ تھل نہر کا مسئلہ بھی نزاع کا باعث بنا ہوا ہے۔ صوبوں کے درمیان متعدد امور پر شدید کشیدگی ہے۔ بلوچستان میں بار بار ہڑتالیں ہو رہی ہیں۔ قوم پرست عناصر کی بن آئی ہے اور ۱۹۴۰ء کی قرارداد اور یو این او کی مداخلت کی باتیں کر رہے ہیں۔ صوبوں کے درمیان کش مکش ہی نہیں اب تو صوبے کی سول انتظامیہ اور کور کمانڈروں کے اختلافات بھی سامنے آ رہے ہیں اور صرف چھوٹے صوبوں میں

ہی نہیں' خود پنجاب کے گورنر اور لاہور کے کور کمانڈر کے اختلافات اور اس کی بنیاد پر بیورو کریسی میں صف بندی سے سب واقف ہیں اور شفاف حکمرانی کی خیر منا رہے ہیں۔

اگر ان تمام امور سے صرف نظر کر لیا جائے اور "سب اچھا ہے" کی رٹ لگائی جاتی رہے تو اس سے زمینی حقائق تو تبدیل نہیں ہو جاتے۔ اختلافات کو افہام و تفہیم سے دُور کرنے کے لیے نمایندہ حکومت اور جمہوری عمل سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں۔

معاشی ترقی کا سراب

جنرل مشرف نے اپنی معاشی اصلاحات اور کارکردگی کو ریفرنڈم کی مہم میں سب سے زیادہ اہمیت دی ہے اور ان کے ہم نوا اور ہم خیال بھی مبادلہ خارجہ کے ذخائر میں اضافے اور بیرونی قرضوں اور امداد کے حصول کو بڑے فخر سے پیش کر رہے ہیں۔ ایک "مذہبی بزرگ" نے تو یہاں تک دعویٰ کر دیا ہے کہ معیشت کی کارکردگی کو جانچنے کے جتنے بھی اشارے (indicators) ہیں وہ سب مثبت اور روشن ہیں۔ ہم پورے ادب سے عرض کریں گے کہ حالات کی یہ تصویر کشی بڑی جزوی' اپنی پسند کی اور بڑی حد تک جانب داری پر مبنی ہے۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ ماضی کی سیاسی حکومتوں کی معاشی کارکردگی ہرگز قابل فخر نہ تھی اور وہ ملک کو مسلسل قرضوں کے شکنجوں میں کس رہی تھیں اور نفع عاجلہ کی خاطر حقیقی معاشی اصلاحات سے غافل تھیں لیکن ہمیں یہ کہنے میں بھی کوئی باک نہیں کہ موجودہ حکومت کی معاشی ٹیم نے بھی کسی بنیادی اصلاح کی فکر نہیں کی ہے۔ اس ٹیم پر بنک کاروں کا غلبہ ہے اور ہمیں احساس ہے کہ وہ اچھے بنک کار ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ ملک کی معیشت صرف ایک بنک کی مانند نہیں۔ جب تک اصل معاشی مسائل کا حل تلاش نہ کیا جائے' معاملات سطحی رہیں گے اور مسائل و مشکلات گرفت میں نہیں آئیں گی۔

یہ صحیح ہے کہ ہوشیار بنک کاری اور قرض دینے والے آقاؤں کی نظر التفات کے باعث' مبادلہ خارجہ کی صورت حال میں نمایاں بہتری آئی ہے۔ ۱۹۹۹ء میں یہ ذخائر خطرناک حد تک کم ہو گئے تھے اور خصوصیت سے ۱۹۹۸ء کے بیرونی حسابات کو منجمد کرنے کے تباہ کن اقدام نے تو ساری دنیا میں ہماری ساکھ کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اس میدان میں آج ہماری پوزیشن بہت بہتر ہے اور مئی ۲۰۰۲ء میں مبادلہ خارجہ کے ذخائر ۳.۵ ارب ڈالر تک پہنچ گئے ہیں۔ لیکن اس ایک اشارے سے جو نتائج نکالے جا رہے ہیں اور جس طرح اس کا کریڈٹ لیا جا رہا ہے وہ حدِ انصاف سے متجاوز ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ توازنِ ادایگی (balance of payments) گذشتہ ۲۰' ۲۵ سال میں پہلی مرتبہ ایک خاص حساب کے مطابق مثبت ہوا ہے' یعنی اگر حکومت کو ملنے والی رقوم (official transactions) کو شامل کر لیا جائے جو بیرونی ممالک سے عطیہ یا قرض ہیں

تو توازن ادایگی ۳۳۱ ملین کے نفع (surplus) میں آجاتا ہے' اور اگر سرکاری ترسیل کو شامل نہ کیا جائے اور صرف تجارت اور دوسرے مالی transactions تک توازن ادایگی کو محدود رکھا جائے تو خسارہ ۵۰۸ ملین ڈالر ہوتا ہے جو ماضی کے اوسطاً ۳ ارب ڈالر کے خسارے سے کہیں کم ہے۔ اس کا کریڈٹ صرف ایک حد تک حکومت کو جاتا ہے کیوں کہ اس کی اصل وجہ تجارت کے خسارے میں کمی ہے جو درآمدات میں کمی کی وجہ سے رونما ہوا ہے' برآمدات کے اضافے کی وجہ سے نہیں۔ نیز بیرون ملک پاکستانیوں کی ترسیلات میں دوگنا اضافہ بین الاقوامی حالات' امریکہ میں پاکستانیوں کے سرمایے کے غیر محفوظ ہوجانے اور عرب امارات میں غیر سرکاری ترسیلات پر پابندی کی وجہ سے ہوا ہے۔

اس ظاہری نفع کے پیچھے بڑے تلخ حقائق ہیں جن میں سب سے اہم چیز برآمدات کا جمود ہے۔ ۱۹۹۸ء سے قبل ملک کی برآمدات ۱۰ ارب ڈالر تک پہنچ رہی تھیں اور اس سال کے لیے بھی یہی ہدف تھا مگر عملاً پہلے ۱۰ مہینے میں ۷.۳۲۳ ارب ڈالر کی برآمدات ہوئی ہیں اور بہت زور لگایا تو توقع ہے ۸.۵ ارب اور ۹ ارب کے درمیان ہوسکیں گی' یعنی ہدف سے ۱۰ سے ۱۵ فی صد کم! چونکہ درآمدات میں کمی برآمدات میں کمی سے زیادہ ہوئی ہے' یعنی ۷.۱ فی صد کے مقابلے میں ۶.۹۳ فی صد' اسی لیے توازنِ تجارت کے خسارے میں کمی آگئی ہے۔ اس کمی سے توازنِ ادایگی اور مبادلہ خارجہ کے ذخائر میں تو بہتری آئی ہے لیکن اسے معیشت کے لیے صحت مند قرار دینا معاشی اصولوں سے ناواقفیت کا ثبوت ہوگا۔

برآمدات میں کمی دراصل معیشت میں جمود اور پیداواری عمل میں سستی کا نتیجہ ہے۔ قومی پیداواری شرح ترقی جو چھٹے منصوبے کے دوران (۸۸-۱۹۸۳ء)' ۶.۳ فی صد سالانہ تھی' ساتویں منصوبے (۹۳-۱۹۸۸ء) کے دوران ۴.۸ فی صد رہی اور آٹھویں منصوبے (۹۸-۱۹۹۳ء) کے دوران ۴.۲ فی صد ہوگئی' ۲۰۰۱-۱۹۹۹ء میں گھٹ کر ۳.۶ فی صد رہی اور اس سال ۲۰۰۲-۲۰۰۱ء کے بارے میں اندازہ ہے ۳ فی صد یا اس سے کچھ کم ہوگی۔ اسی طرح درآمدات میں کمی کا اثر بالآخر ملک کی پیداوار پر پڑے گا اور اس طرح خسارے میں یہ کمی کوئی نفع کا سودا نہیں۔ پھر اسٹیٹ بنک نے کھلی منڈی سے ڈالر خرید کر مبادلہ خارجہ کے ذخائر میں اضافہ کیا ہے۔ اس سے مبادلہ خارجہ کو سہارا ضرور میسر آیا ہے اور ڈالر کے مقابلے میں روپے کی قیمت میں بھی استحکام آیا لیکن اس طرح جو ذخائر حاصل ہوئے ہیں وہ کسی پیدا آوری عمل کا نتیجہ نہیں' بلکہ ان کے حصول کے لیے جو ۲۰۰ ارب روپیا استعمال میں آیا ہے وہ ایک غیر پیدا آوری عمل کی نذر ہوگیا۔ اگر اسے ملک میں سرمایہ کاری کے لیے استعمال کیا جاتا' تو یہ روزگار کی فراہمی' غربت کے خاتمے اور پیداوار کے اضافے میں مددگار ہوسکتا تھا۔

کسی ملک کی معیشت کو جانچنے کا صحیح معیار ملکی پیداوار میں اضافہ' برآمدات میں اضافہ' تقسیم دولت میں انصاف' روزگار کی فراہمی' فی کس آمدنی میں اضافہ' سرمایہ کاری میں اضافہ اور معیشت کے پھیلاؤ کے ساتھ ٹیکس کی آمدنی میں اضافہ ہے لیکن ان میں سے جو بھی اشارہ آپ لیں معیشت کی صورت حال اچھی نظر نہیں آئے گی۔ ملک میں سرمایہ کاری میں کمی آرہی ہے اور یہ شرح پچھلے چند سالوں میں قومی پیداوار کے ۱۷ اور ۱۸ فی صد سے کم ہو کر ۱۳ فی صد سے بھی کم رہ گئی ہے۔ بیرونی سرمایہ کاری کی بڑی توقعات تھیں لیکن وہ بھی پوری نہیں ہوئیں۔ ۹۶-۱۹۹۵ء میں سالانہ بیرونی سرمایہ کاری ۱.۵ ارب ڈالر سے متجاوز ہو گئی تھی جو ۱۹۹۹ء میں ۶۰۰ ارب ڈالر پر آ گئی تھی۔ ۲۰۰۱-۲۰۰۰ء میں یہ گر کر ۱۸۰ ملین ڈالر ہو گئی۔ سال رواں میں ۲۸۷ ملین ڈالر ہوئی ہے جو ۵۰۰ ملین کے ہدف سے بہت کم ہے۔

ملک میں پیداواری عمل میں سستی کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ۲۰۰۱-۲۰۰۰ء میں ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء کے مقابلے میں توانائی کے تجارتی استعمال میں کمی آئی اور سال رواں میں اس میں مزید کمی آئی ہے۔ یہی کیفیت گیس اور بجلی کے استعمال کی ہے۔ توانائی کے تمام وسائل کا یہی حال رہا ہے جو معیشت میں جمود اور سست روی کا ثبوت ہے۔ بے روزگاری میں اضافہ ہوا ہے۔ زراعت شدید مشکلات سے دوچار ہے اور گنے اور چینی کی پیداوار اور ایک حد تک سیمنٹ کو چھوڑ کر زراعت اور صنعت دونوں کساد بازاری کا شکار ہیں۔ سوشل سیکٹر (تعلیم' صحت) اور پبلک سیکٹر میں ترقیاتی مصارف میں برابر کمی ہے اور نجی شعبے میں بھی کریڈٹ کا استعمال سال گذشتہ کے مقابلے میں تقریباً نصف ہے۔

یہ سب علامات معیشت میں جمود کی ہیں' افزونی کی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیکس سروے اور سی بی آر' حکومت اور فوج کی ساری ترک تازیوں کے باوجود ٹیکس سے حکومت کی آمدنی کا ہدف پورا نہیں ہو رہا۔ اس سال پانچ بار ہدف کو کم کیا گیا ہے جو ۴۵۷ ارب روپے سے کم کر کے اب ۴۱۴ ارب روپے پر لایا جا چکا ہے اور اندازہ ہے کہ عملاً ۴۰۰ یا زیادہ سے زیادہ ۴۰۴ ارب روپے حاصل ہوں گے جس سے بجٹ کا خسارہ ۶۰ ارب کی حد تک بڑھنے کا خطرہ ہے۔ اور یہ سب اس شہرہ عالم ٹیکس سروے کے بعد ہے جس نے حکومت اور اہل تجارت دونوں کے درمیان مہینوں جنگ کی کیفیت پیدا کر دی تھی' فوج بھی میدان میں اتار دی گئی تھی اور وعدے کیے جا رہے تھے کہ اب ٹیکس کی آمدنی میں بیش بہا اضافہ ہوگا' لیکن اگر معیشت میں نمو ہی نہ ہو' سرمایہ کاری ٹھٹھری ہوئی ہو' غربت میں اضافہ ہو رہا ہو' جو تمام عالمی اداروں کی رپورٹوں سے عیاں ہے تو خزانے میں اضافہ کیسے ہو؟ غربت میں اضافے کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۰ء میں آبادی کا ۱۷ فی صد خطِ افلاس سے نیچے تھا جو ۱۹۹۷ء میں ۳۷ فی صد اور ۲۰۰۱ء میں ۳۹ فی صد ہو گیا ہے۔ غربت اور افلاس کی وجہ سے فاقہ کشی سے

ہونے والی اموات اور خودکشیاں پاکستان میں پہلی مرتبہ واقع ہو رہی ہیں۔

ملک میں فی کس آمدنی میں برابر کمی ہو رہی ہے اور پہلی بار ہماری فی کس آمدنی بھارت میں فی کس آمدنی سے کم ہوگئی ہے۔ ۹۷-۱۹۹۶ء میں فی کس آمدنی ۴۹۳ ڈالر تھی جو ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء میں گھٹ کر ۴۴۶ ڈالر رہ گئی اور ۲۰۰۲ء میں یہ آمدنی صرف ۴۲۹ ڈالر ہے۔ ملکی پیداوار کی ترقی کی رفتار ۳.۸۹ فی صد سالانہ سے کم ہو کر ۲.۳۹ فی صد رہ گئی ہے اور بے روزگاری میں اضافہ لیبر فورس سے ۵.۸۹ فی صد سے بڑھ کر سال رواں میں ۷.۸۲ فی صد ہو گیا ہے۔ قومی بجٹ اور قومی سرمایہ کاری کی شرح میں بھی کمی ہوئی ہے۔ ملکی بچت ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء میں قومی پیداوار کا ۱۵.۴ فی صد تھیں جو ۲۰۰۱-۲۰۰۰ء میں کم ہو کر ۱۴.۵ رہ گئی اور سال رواں میں مزید کمی واقع ہوئی ہے۔ یہی حال سرمایہ کاری کا ہے جو ۲۰۰۰-۱۹۹۹ء میں قومی دولت کا ۱۵.۸ فی صد تھی مگر ۲۰۰۱-۲۰۰۰ء میں ۱۴.۹ فی صد اور اس سال اس سے بھی کم آ رہی ہے۔ (اسٹیٹ بنک کی سہ ماہی رپورٹ اور نیشنل بنک آف پاکستان کی رپورٹ' پاکستانی معیشت کے کلیدی اشارے' مارچ ۲۰۰۲ء)۔

مہنگائی کمر توڑ صورت اختیار کر گئی ہے۔ بجلی' گیس' پٹرول خصوصیت سے نشانہ ستم ہیں اور سال میں تین تین بار اور چار چار بار اضافہ ہو رہا ہے۔ تنخواہ دار اور کم آمدنی والے خاندان چیخ رہے ہیں' پنشن والے آہ و بکا کر رہے ہیں اور کوئی سننے والا نہیں۔ جب عالمی منڈیوں میں پٹرول کی قیمت کم ہوتی ہے تب بھی یہاں ڈیزل اور پٹرول کی قیمتیں بڑھا دی جاتی ہیں۔ اس وقت بھی بجٹ سے پہلے ۱۷ فی صد تک کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور بلوچستان کے ٹرانسپورٹر ہڑتال کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

معیشت کی اس صورت حال کو کسی اعتبار سے بھی تسلی بخش قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قرضوں کے بار میں بھی عملاً اضافہ ہوا ہے گو اضافے کی رفتار میں کمی آئی ہے۔ یہ بیرونی ساہوکاروں کی نظر التفات اور سیاسی وجوہ سے اور قرضوں کی ری شیڈولنگ کی وجہ سے ہوا ہے۔

غربت کے خاتمے اور منصفانہ اور خوش حال معاشرے کے قیام کے سلسلے میں کوئی حقیقی پیش رفت نہیں ہوئی اور نہ سود کے خاتمے کے لیے کوئی قابل ذکر اقدام ہوا ہے جس کے بارے میں سپریم کورٹ کی دی ہوئی مہلت ۳۰ جون ۲۰۰۲ء کو ختم ہو رہی ہے۔ اطلاعات یہی ہیں کہ اب پھر حکومت مزید وقت کے حصول یا سابقہ فیصلے کو کالعدم کرانے کی درخواست کرنے والی ہے۔ (ڈان' ۱۵ مئی ۲۰۰۲ء)

دنیا میں ہمارا مقام

جنرل صاحب کا دعویٰ ہے کہ پاکستان کی ساکھ دنیا میں بڑھی ہے' قوم میں اعتماد پیدا ہوا ہے اور ہم سر اٹھا کر چلنے کے لائق ہو گئے ہیں۔ کاش! حقیقت کی دنیا میں ایسا ہی ہوا ہوتا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ۱۱ ستمبر کے

بعد امریکہ نے ہمیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر کے جنرل صاحب کو تعریف و توصیف کی رشوت تو بہت دی ہے مگر پاکستان نے سیاسی، عسکری، اخلاقی اور معاشی ہر اعتبار سے نقصان ہی نقصان اٹھایا ہے۔ ایک طرف ہزاروں معصوم انسانوں کے خونِ ناحق کی ذمہ داری ہم پر بھی عائد ہوئی، تو دوسری طرف ہماری اپنی آزادی اور خودمختاری پر شدید ضرب لگی ہے۔ آج ہماری سرزمین پر امریکی فوجوں کے چار اڈے قائم ہیں۔ ہمارے ہوائی اڈوں پر ان کے کمپیوٹر قابض ہیں اور ہر ہر فرد کے بارے میں ساری معلومات ان کی جھولی میں جارہی ہیں۔ ہماری پولیس ان کی ایف بی آئی کے زیرتربیت ہے۔ ہماری سیاسی جماعتوں کو جمہوریت کی تعلیم دینے کے لیے ۵۸ ملین ڈالر کا پروگرام شروع کر دیا گیا ہے۔ وزیرستان اور فیصل آباد میں ان کے کمانڈو ہماری پولیس کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ امریکی سفیر دعویٰ کر رہی ہیں کہ اب ایف بی آئی کے ماہرین محض ہفتہ دو ہفتہ کے معاملے کے لیے نہیں آرہے، بلکہ یہاں مستقل مقیم ہیں اور رہیں گے۔ امریکہ کا افغانستان آپریشن کا کمانڈر کھلے بندوں اعلان کر رہا ہے کہ ''پاکستان میں ہماری فوجیں اس وقت تک رہیں گی جب تک ہم اس کی ضرورت محسوس کریں گے''۔

ہماری معیشت آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک کے ہاتھوں اس طرح گروی ہوگئی ہے کہ اب بجٹ قوم تو کیا، کابینہ کے سامنے آنے سے بھی پہلے عالمی بنک کے نمایندوں سے منظور کرایا جاتا ہے اور ڈیفنس بجٹ، بجٹ کا خسارہ اور آمد و صرف کے تمام تخمینے بنک کے حکام کے ارشادات ہی نہیں احکامات کے مطابق طے ہو رہے ہیں۔ بیرونی ذرائع ابلاغ میں یہ بھی آرہا ہے کہ ہماری فوجی نقل و حرکت اور نیوکلیر صلاحیت کی مکمل نگرانی کی جارہی ہے اور اگر لبنان کے امریکی عیسائی مصنف فواد عجمی کا دعویٰ (ریڈرز ڈائجسٹ، اپریل ۲۰۰۲ء) درست ہے تو اب ہماری ایٹمی تنصیبات امریکہ کی دسترس میں ہیں۔

اس پس منظر میں بھارت اور اسرائیل کا روز افزوں سیاسی اور عسکری تعاون، جنگی ساز و سامان کی بھارت کو فراہمی اور بھارت اور امریکہ کا سیاسی گٹھ جوڑ اور مشترک فوجی مشقیں اور ''سرحدی دہشت گردی'' کے نام پر دونوں کا پاکستان کو بلیک میل کرنا اور بھارت کا ہماری سرحدوں پر چھ ماہ سے فوجوں کو تعینات کرنا اور ایسی مشقیں کرنا جن کی دھول ہماری سرحدوں تک پہنچ رہی ہے وہ خطرناک صورت حال ہے جس میں جنرل صاحب کی قیادت نے ملک کو لا پھنسایا ہے۔ ریفرنڈم میں اخلاقی دیوالیہ ہونے کے بعد وہ امریکہ اور بھارت دونوں کے لیے زیادہ تر نوالہ بن گئے ہیں اور ان کی زدپذیری (vulnerability) میں خطرناک حد تک اضافہ ہوگیا ہے۔ امن اور عزت بھیک مانگ کر حاصل نہیں ہوتے، وہ تو عزم اور قوت بازو سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ یہ تو رہ و رسم شہ بازی کی دنیا ہے۔ اس میں دشمن سے مصافحہ اور غیروں سے مصالحت سے کچھ

حاصل نہیں ہوسکتا۔

کارگل کے موقع پر میاں نواز شریف اور صدر کلنٹن میں ہونے والی ملاقات کی تمام تفصیلات خاص طور پر اس موقع پر شائع کی گئی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بالکل وہی منظر دہرایا جا رہا ہے۔ پاکستانی قوم آج ایک ایسے مقام پر کھڑی ہے جہاں اسے اپنی زندگی' آزادی اور عزت کے تحفظ کے لیے ایک بڑا فیصلہ کرنا ہوگا۔ اس وقت دونوں' یعنی ایک طرف جنرل پرویز مشرف اور پوری فوجی قیادت اور دوسری طرف ملک کی پوری دینی اور سیاسی قیادت ایک عظیم آزمایش سے دوچار ہیں۔ ریفرنڈم نے جنرل صاحب کو کمزور کیا ہے' مضبوط نہیں۔ اور فوج کو بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی قوت کا راز قوم ہے کوئی اور نہیں۔ بھارت اپنی شاطرانہ چالیں بڑی ہوشیاری سے چل رہا ہے اور امریکہ اس کی پشت پر ہے۔ اگر ہم اس کھیل کو سمجھنے سے قاصر ہیں یا سمجھنا نہیں چاہتے تو یہ تباہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ قوم میں بڑی جان ہے اور اگر اللہ کی رسی کو تھام کر قوم کو ساتھ لیا جائے تو آج بھی ملک نہ صرف اپنا دفاع کرسکتا ہے' بلکہ دشمن کے دانت کھٹے کرسکتا ہے لیکن اس کے لیے ایمان' عزم اور قومی اتحاد اور یگانگت کی ضرورت ہے۔ دشمن کی پوری کوشش ہے (اور جن کو آپ دوست سمجھ رہے ہیں وہ اس کھیل میں برابر کے شریک ہیں) کہ پاکستانی قیادت کو دباؤ میں لا کر پاکستان کو اپنی کشمیر پالیسی کو بھی اسی طرح تبدیل کرنے پر مجبور کر دیں جس طرح کارگل اور پھر افغانستان کی پالیسی کو تبدیل کرایا ہے۔ لیکن یہ ہمارے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے' سیاسی مصالح کا نہیں۔

پاکستان اور کشمیر ایک ہی جسم کے حصے ہیں۔ اس میں کسی حصے کو پہلے اور کسی کو پیچھے نہیں کیا جاسکتا۔ کشمیر کی تحریک مزاحمت پاکستان کے دفاع کی تحریک ہے اور اس کا کمزور ہونا' پاکستان کا کمزور ہونا بلکہ بالآخر بھارت کے شکنجے میں گرفتار ہوجانے کے مترادف ہوگا۔ یہ وقت بالغ نظری سے دشمن کے کھیل کو سمجھ کر قوم کو اعتماد میں لینے اور قوم میں وحدت اور یک جہتی پیدا کرنے کا ہے۔ جس طرح سیاست دانوں اور سیاسی جماعتوں سے بجا طور پر مطالبہ ہوا ہے کہ اپنی ماضی کی غلطیوں کا اعتراف کریں' اسی طرح فوجی قیادت کے لیے بھی ضروری ہے کہ سیاست میں فوج کی دراندازی کے جو تباہ کن نتائج رونما ہوئے ہیں ان کا اعتراف کرے اور اپنے اصل رول (دفاعِ وطن) کے لیے پورے طور پر یکسو ہو کر اس میں منہمک ہوجائے۔ نظامِ سیاست میں حصہ اور حق مانگنے کی باتیں نہ ملک کے مفاد میں ہیں اور نہ خود فوج اور اس کی دفاعی صلاحیت کے لیے مفید۔ اسے اپنے دائرے میں رہنا چاہیے تاکہ اسے اس کا حق مل سکے لیکن اس کا کوئی ایسا کردار نہیں جو اسے اقتدار میں شریک بنانے سے عبارت ہو۔ قائداعظمؒ اور ان کے تصور پاکستان کی باتیں تو بہت ہوتی ہیں لیکن قائد کے تصور سے کسی وفاداری کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا۔

قائداعظم کی ہدایات

آیئے اس سلسلے میں قائداعظمؒ کے محکم ارشادات کو کسی تحفظ کے بغیر قبول کریں اور بیوروکریسی اور فوج دونوں کو ان حدود کا پابند کریں جو ان کی کارکردگی کے لیے ضروری ہیں۔ اہل سیاست بھی اپنے طور طریقے درست کریں اور ایک نظام اخلاق کی پابندی کا عہد کریں اور بیوروکریسی اور فوج بھی اپنی حدود کی پابند ہو۔ قومی یک جہتی ہی کے لیے ضروری ہے کہ جلد از جلد انتخابات کا اہتمام کیا جائے اور حقیقی معنوں میں شفاف' آزاد اور منصفانہ انتخابات کے ذریعے ملک میں نئی سیاسی قیادت کو زمامِ کار سونپی جائے تاکہ سب مل کر دستور کو اس کی صحیح اسپرٹ میں چلانے اور اس کا احترام کرنے کا عہد اور اہتمام کریں۔

قائداعظمؒ نے اس سلسلے میں جو ہدایات دی ہیں وہ یہ ہیں۔ ۲۵ مارچ ۱۹۴۸ء کو چٹاگانگ کے مقام پر سول حکام کو خطاب کرتے انھوں نے فرمایا:

> آپ کو اپنا فرض منصبی خادموں کی طرح انجام دینا ہے۔ آپ کو اس سیاسی جماعت سے یا اُس سیاسی جماعت سے کوئی سروکار نہیں۔ یہ آپ کا کام نہیں' یہ سیاست دانوں کا کام ہے کہ وہ موجودہ آئین کے تحت یا آیندہ آئین' جو بالآخر تشکیل پائے گا' کے تحت اپنے موقف کے لیے لڑیں۔ لہٰذا آپ کا نہ اِس سیاسی جماعت سے کوئی تعلق ہے اور نہ اُس سیاسی جماعت سے۔ آپ سرکاری ملازم ہیں۔ جس جماعت کو اکثریت حاصل ہوگی وہ حکومت بنائے گی اور آپ کا فرض ہے کہ آپ وقتی طور پر اس حکومت کی خدمت ملازمین کی طرح کریں' سیاست دانوں کی طرح نہیں۔

پھر پشاور میں ۱۶ اپریل ۱۹۴۸ء کو گزنٹیڈ افسران کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

> آپ کو کسی سیاسی جماعت یا کسی سیاست دان کے سیاسی دباؤ میں نہیں آنا چاہیے۔ اگر آپ پاکستان کے وقار اور عظمت کو بڑھانا چاہتے ہیں تو آپ کو کسی دباؤ کا شکار نہیں ہونا چاہیے' اپنا فرض منصبی عوام اور ملک کے خادم بن کر بے خوفی اور دیانت داری کے ساتھ سرانجام دینا چاہیے۔

اور پھر ۱۴ جون ۱۹۴۸ء کو کوئٹہ میں اسٹاف کالج میں فوجی قیادت کو واضح ہدایات دیں:

> ایک بات اور ہے۔ مجھے یہ بات کہنے کی تحریک اس لیے ہوئی ہے کہ ایک دو نہایت اعلیٰ افسروں کے ساتھ گفتگو کے دوران مجھے یہ معلوم ہوا کہ افواج پاکستان نے جو حلف اٹھایا ہے انھیں اس کے مضمرات کا علم نہیں ہے۔ بلاشبہہ حلف تو ایک ظاہری شکل وصورت کی بات ہوتی ہے۔ جو چیز زیادہ اہم ہوتی ہے' وہ ہے صحیح جذبہ اور اس کی روح۔ لیکن اس معاملے میں شکل وصورت بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ میں اس موقع پر آپ کے حافظے کو تازہ کرنے کے لیے مقررہ حلف کے الفاظ پڑھتا ہوں:

''میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر عہد کرتا ہوں کہ میں آئین اور مملکت پاکستان کا وفادار رہوں گا۔ (آئین اور مملکت پاکستان کے الفاظ پر توجہ فرمایئے اور یہ) کہ میں مملکت پاکستان کی افواج میں دیانت داری اور وفاداری کے ساتھ خدمات سرانجام دینے کا پابند رہوں گا، اور اپنی بھرتی کی شرائط کے مطابق جہاں کہیں بھی ہوائی، بری اور بحری ذریعے سے جانے کا حکم ملے گا، جاؤں گا۔ اور میں ان تمام احکام کو بجالاؤں گا جو میرے اوپر تعینات شدہ افسر جاری کرے گا''۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے اصل بات تو جذبہ ہے۔ میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ میں مملکت کے آئین کا وفادار رہوں گا تو آپ اس آئین کا مطالعہ کریں جو فی الوقت پاکستان میں نافذ العمل ہے اور اس کے حقیقی اور قانونی مضمرات کو سمجھیں۔

قائد کے اس ارشاد کی روشنی میں سول اور فوجی ملازمین کی ذمہ داری ہے کہ دستور کا مطالعہ کریں اور اس حلف پر قائم ہو جائیں جو دستور میں مرقوم ہے۔ جو بھی اس عہد سے سرموانحراف کرے اسے قرار واقعی سزا ملنی چاہیے تاکہ آیندہ کسی کو اس کی خلاف ورزی کی جرأت نہ ہو۔

ان حالات میں پوری قوم اور خود فوجی قیادت کے لیے اصلاح احوال کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے اکتوبر کے انتخابات کی تیاری اور پوری دیانت کے ساتھ دستور کے مطابق منتخب قیادت کو زمام کار کی منتقلی۔ انتقام کی سیاست کی جگہ انصاف کی سیاست کا قیام وقت کی ضرورت ہے۔ جنرل پرویز مشرف کو بھی حالات کا دردمندی اور بصیرت سے جائزہ لینا چاہیے اور عوام کے فیصلے کو خوش دلی کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ کوئی شخص قانون سے بالا نہیں اور کوئی انسان ناگزیر نہیں۔ ملک کی ترقی اور استحکام ملک کے نظریے سے وفاداری، قوم کی بیداری، اور اصلاح کے لیے قومی اتفاق رائے پیدا کرنے میں ہے۔

اگر ہماری قیادت ریفرنڈم کے تلخ پیغامات سے یہ سبق حاصل کرلے تو شر سے خیر پیدا ہوسکتا ہے اور ملک ترقی کی شاہراہ پر ایک بار پھر گامزن ہوسکتا ہے۔ خدا کرے کہ اس نازک لمحے میں یہ قوم اور اس کی قیادت صحیح فیصلہ کرسکے تاکہ تاریکیاں چھٹ جائیں اور صبح امید نئی روشنی لیے ہوئے نمودار ہوسکے ؎

گھبرائیں نہ ظلمت سے گزرنے والے
آغوش میں ہر شب کے سحر ہوتی ہے

ہدایت وضلالت

کوئی ایسی نشانی نازل کر دینا جو تمام کفار کو ایمان و طاعت کی روش اختیار کرنے پر مجبور کر دے اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ کام اس کی قدرت سے باہر ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح کا جبری ایمان اس کو مطلوب نہیں ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ لوگ عقل وخرد سے کام لے کر اُن آیات کی مدد سے حق کو پہچانیں جو کتاب الٰہی میں پیش کی گئی ہیں، جو تمام آفاق میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، جو خود ان کی اپنی ہستی میں پائی جاتی ہیں۔ پھر جب ان کا دل گواہی دے کہ واقعی حق وہی ہے جو انبیا علیہم السلام نے پیش کیا ہے، اور اس کے خلاف جو عقیدے اور طریقے رائج ہیں وہ باطل ہیں، تو جان بوجھ کر باطل کو چھوڑیں اور حق کو اختیار کریں۔ یہی اختیاری ایمان اور ترک باطل اور اتباع حق وہ چیز ہے جو اللہ تعالیٰ انسان سے چاہتا ہے۔ اسی لیے اس نے انسان کو ارادے اور اختیار کی آزادی دی ہے۔ اسی بنا پر اس نے انسان کو یہ قدرت عطا کی ہے کہ صحیح اور غلط، جس راہ پر بھی وہ جانا چاہے جاسکے۔ اسی وجہ سے اس نے انسان کے اندر خیر اور شر کے دونوں رجحانات رکھ دیے ہیں، فجور اور تقویٰ کی دونوں راہیں اس کے آگے کھول دی ہیں، شیطان کو بہکانے کی آزادی عطا کی ہے، نبوت اور وحی اور دعوتِ خیر کا سلسلہ راہِ راست دکھانے کے لیے قائم کیا ہے، اور انسان کو انتخابِ راہ کے لیے ساری مناسبِ حال صلاحیتیں دے کر اِس امتحان کے مقام پر کھڑا کر دیا ہے کہ وہ کفر وفسق کا راستہ اختیار کرتا ہے یا ایمان و طاعت کا۔ اس امتحان کا سارا مقصد ہی فوت ہو جائے اگر اللہ تعالیٰ کوئی ایسی تدبیر اختیار فرمائے جو انسان کو ایمان اور اطاعت پر مجبور کر دینے والی ہو۔

جبری ایمان ہی مطلوب ہوتا تو نشانیاں نازل کر کے مجبور کرنے کی کیا حاجت تھی، اللہ تعالیٰ انسان کو اسی فطرت اور ساخت پر پیدا فرما سکتا تھا جس میں کفر، نافرمانی اور بدی کا کوئی امکان ہی نہ ہوتا، بلکہ فرشتوں کی طرح انسان بھی پیدائشی فرماں بردار ہوتا۔ یہی حقیقت ہے جس کی طرف متعدد مواقع پر قرآن مجید میں اشارہ کیا گیا ہے، مثلاً فرمایا: وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ

النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ○ (یونس ۱۰:۹۹) ''اگر تمھارا رب چاہتا تو زمین کے رہنے والے سب کے سب لوگ ایمان لے آتے۔ اب کیا تم لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کرو گے؟'' اور وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ○ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ط وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ۔ (ھود ۱۱:۱۱۸-۱۱۹) ''اگر تیرا رب چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی امت بنا سکتا تھا۔ وہ تو مختلف راہوں پر ہی چلتے رہیں گے (اور بے راہ رویوں سے) صرف وہی بچیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے۔ اسی لیے تو اس نے ان کو پیدا کیا تھا''۔

جن لوگوں کا حال یہ ہو کہ معقولیت کے ساتھ ان کو سمجھانے اور راہ راست دکھانے کی جو کوشش بھی کی جائے اس کا مقابلہ بے رخی و بے التفاتی سے کریں، ان کا علاج یہ نہیں ہے کہ ان کے دل میں زبردستی ایمان اتارنے کے لیے آسمان سے نشانیاں نازل کی جائیں، بلکہ ایسے لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ جب ایک طرف انھیں سمجھانے کا حق پورا پورا ادا کر دیا جائے اور دوسری طرف وہ بے رخی سے گزر کر قطعی اور کھلی تکذیب پر، اور اس سے بھی آگے بڑھ کر حقیقت کا مذاق اڑانے پر اتر آئیں، تو ان کا انجامِ بد انھیں دکھا دیا جائے۔ یہ انجامِ بد اس شکل میں بھی انھیں دکھایا جاسکتا ہے کہ دنیا میں وہ حق اُن کی آنکھوں کے سامنے ان کی ساری مزاحمتوں کے باوجود غالب آجائے جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ اس کی شکل یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان پر ایک عذابِ الیم نازل ہو جائے اور وہ تباہ و برباد کر کے رکھ دیے جائیں۔ اور وہ اس شکل میں بھی ان کے سامنے آسکتا ہے کہ چند سال اپنی غلط فہمیوں میں مبتلا رہ کر وہ موت کی ناگزیر منزل سے گزریں اور آخر کار ان پر ثابت ہو جائے کہ سراسر باطل تھا جس کی راہ میں انھوں نے اپنا تمام سرمایۂ زندگانی کھپا دیا اور حق وہی تھا جسے انبیا علیہم السلام پیش کرتے تھے اور جسے یہ عمر بھر ٹھٹھوں میں اڑاتے رہے۔......

جستجوے حق کے لیے کسی کو نشانی کی ضرورت ہو تو کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں، آنکھیں کھول کر ذرا اس زمین ہی کی روئیدگی کو دیکھ لے، اسے معلوم ہو جائے گا کہ نظامِ کائنات کی جو حقیقت (توحیدِ الٰہ) انبیا علیہم السلام پیش کرتے ہیں وہ صحیح ہے، یا وہ نظریات صحیح ہیں جو مشرکین یا منکرین خدا بیان کرتے ہیں۔ زمین سے اُگنے والی بے شمار انواع و اقسام کی چیزیں جس کثرت سے اُگ رہی ہیں، جن مادوں اور قوتوں کی بدولت اُگ رہی ہیں، جن قوانین کے تحت اُگ رہی ہیں، پھر ان کے خواص اور صفات میں اور بے شمار مخلوقات کی اَن گنت ضرورتوں میں جو صریح مناسبت پائی جاتی ہے، ان ساری چیزوں کو دیکھ کر صرف ایک احمق ہی اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی حکیم کی حکمت، کسی علیم کے علم، کسی قادر و توانا کی قدرت اور کسی خالق کے منصوبۂ تخلیق کے بغیر بس یونہی آپ سے آپ ہو رہا ہے۔ یا اس سارے منصوبے کو بنانے اور

چلانے والا کوئی ایک خدا نہیں ہے، بلکہ بہت سے خداؤں کی تدبیر نے زمین اور آفتاب و ماہتاب اور ہوا اور پانی کے درمیان یہ ہم آہنگی، اور ان وسائل سے پیدا ہونے والی نباتات اور بے حد و حساب مختلف النوع جان داروں کی حاجات کے درمیان یہ مناسبت پیدا کر رکھی ہے۔ ایک ذی عقل انسان تو، اگر وہ کسی ہٹ دھرمی اور پیشگی تعصب میں مبتلا نہیں ہے، اس منظر کو دیکھ کر بے اختیار پکار اُٹھے گا کہ یقیناً یہ خدا کے ہونے اور ایک ہی خدا کے ہونے کی کھلی کھلی علامات ہیں۔ ان نشانیوں کے ہوتے اور کس معجزے کی ضرورت ہے جسے دیکھے بغیر آدمی کو توحید کی صداقت کا یقین نہ آسکتا ہو؟

اس کی قدرت تو ایسی زبردست ہے کہ کسی کو سزا دینا چاہے تو پل بھر میں مٹا کر رکھ دے۔ مگر اس کے باوجود یہ سراسر اس کا رحم ہے کہ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا۔ برسوں اور صدیوں ڈھیل دیتا ہے، سوچنے اور سمجھنے اور سنبھلنے کی مہلت دیے جاتا ہے، اور عمر بھر کی نافرمانیوں کو ایک توبہ پر معاف کر دینے کے لیے تیار رہتا ہے (تفہیم القرآن، ج ۳، ص ۴۷۷-۴۸۰)۔

جائزے اور محاسبے کے معیار

کام اچھا ہوا یا بہت اچھا ہوا' خراب ہوا یا بہت خراب ہوا' اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ جائزے کا معیار کیا ہے۔ جائزے کا معیار کوئی ایک نہیں ہوسکتا۔ مختلف حوالے اور مقاصد جائزے کے نظام اور نتائج کو متاثر کرتے ہیں۔ کون' کیوں اور کب جائزہ لے رہا ہے اور کس انداز سے لے رہا ہے--- یہ سوالات اچھے کام کو برا اور برے کام کو اچھا بنا سکتے ہیں۔ بالعموم جائزہ معروضی (objective) نہیں ہوتا بلکہ موضوعی (subjective) ہوتا ہے۔

کسی ایک ہی کام کے جائزے کے لیے اگر مختلف حوالوں کو معیار بنایا جائے تو نتائج مختلف ہوسکتے ہیں:

پیش رفت: دوران کام رفتار اور سمت کے تعین کے لیے کیا جاتا ہے۔ کہاں ہونا چاہیے تھا اور کہاں ہیں؟

مطلوبہ مقاصد: طویل المیعاد اور قلیل المیعاد مقاصد کے اعتبار سے کس قدر حصول ممکن ہوا؟

وسائل و صلاحیت: استعداد کے لحاظ سے کیا ممکن تھا اور کیا کیا گیا ہے؟

مسابقت: ایک ہی نوعیت کے کام کرنے والے مختلف افراد اور اداروں کا موازنہ' مقابلتاً کون آگے اور کون پیچھے ہے؟

توقعات: دوستوں اور دشمنوں کی' اور کام کرنے والوں اور کام کو دیکھنے والوں کی توقعات کیا تھیں؟ کس قدر پوری ہوئیں؟

وقت: ماضی' حال' مستقبل کے تناظر میں تاریخی وعصری پیمانے پر کہاں پہنچے ہیں؟

بقا و ارتقا: مستقبل میں بقا وارتقا کے لحاظ سے امکانات بڑھ گئے ہیں یا کم ہوگئے ہیں؟

آخرت: میزانِ حشر میں کامیابی کے درجات بلند ہوئے ہیں یا کم ہوئے ہیں؟

ایک جامع جائزے میں سب پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے

اہل تقویٰ کے اوصاف

ڈاکٹر محمد بلال خان

قرآن حکیم میں جن آیات میں تقویٰ کا ذکر آیا ہے' ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام الٰہی تقویٰ کو کسی ایک محدود معنوں میں استعمال نہیں کرتا' بلکہ متعدد آیات میں اس کے مختلف پہلوؤں کی تشریح بھی کرتا ہے۔ اس سے اہل تقویٰ کے ذاتی' روحانی' اخلاقی' سماجی' ازدواجی' عسکری اور تحقیقی اوصاف سامنے آتے ہیں اور واضح ہوتا ہے کہ ایک متقی کی عملی زندگی کا نمونہ کیا ہونا چاہیے۔ ذیل میں قرآنی آیات کی روشنی میں ان اوصاف کی نشان دہی کی گئی ہے۔

اہل تقویٰ کے اوصاف انھیں عام لوگوں سے ممتاز کرتے ہیں۔ قرآن انھیں اللہ کے رفیق' پیغمبروں کے ساتھی' اہلیت و صلاحیت کے مالک' عزت و مرتبے کے مالک' پاکیزہ اور دنیا میں عذاب خداوندی سے بچے رہنے والے قرار دیتا ہے (الجاثیہ ۴۵:۱۹' النبا ۷۸:۳۱' الحجرات ۴۹:۱۳' الزمر ۳۹:۷۸' مریم ۱۹:۹۷' السجدہ ۳۲:۱۸۰)۔ ان کے لیے زمین و آسمان سے برکتوں کا نزول ہوتا ہے اور یہ اخروی فلاح و کامرانی اور جنت کے حق دار قرار پاتے ہیں۔ انھیں حزن و ملال لاحق نہیں ہوتے۔ ان کے اعمال ایمان و حسنات میں مسلسل بلندی کا باعث بنتے ہیں۔ کعبۃ اللہ کی نگہبانی بھی ان کے سپرد کی گئی۔ حد یہ کہ ان کی جانیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ پاک صاف ہوں اور ان کا استقبال اس حال میں کیا جاتا ہے کہ: تم پر سلامتی ہو' جاؤ جنت میں ان اعمال کے بدلے جو تم کرتے تھے۔ (مریم ۱۹:۶۳' الاعراف ۷:۹۶' النحل ۱۶:۳۲' المائدہ ۵:۹۳' الانفال ۸:۴۴)۔

بنیادی خصوصیت

اہل تقویٰ صراط مستقیم پر چلنے کے خواہاں ہونے کے ساتھ ہدایت ربانی سے فیض یاب ہونے کی سعادت حاصل کرتے ہیں (فاتحہ ۱:۵' البقرہ ۲:۱۰)۔ قرآن پاک کے آغاز ہی میں ارشاد ہے کہ یہ کتاب

متقین کے لیے ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ قرآن عام لوگوں کے لیے ایک بیان ہے جب کہ متقین کے لیے ہدایت کا سامان رکھتا ہے (آل عمران ۳:۱۳۸، الزمر ۳۹:۱۲۸، الطلاق ۶۵:۱۰، الحاقہ ۶۹:۴۸)۔ اس لیے قرآن سے استفادہ کرنے کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز تقویٰ ہے۔ عربی زبان جاننا بھی ضروری ہے، تاریخ انسانی اور کائنات کا علم جتنا وسیع ہوگا اسی قدر قرآن پاک سے زیادہ فائدہ ہوگا۔ لیکن قرآن پاک کا اصل مقصد ہدایت وہی حاصل کرے گا جو صاحب تقویٰ ہوگا۔ جو شخص تقویٰ سے خالی ہے، اس کا علم خواہ کتنا وسیع ہو، وہ قرآن پاک سے پوری طرح فیض یاب نہیں ہو سکے گا۔ یوں سمجھیے کہ تقویٰ ہدایت ربانی کی شرطِ اول ہے۔ اس لحاظ سے یہ صفت بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔

روحانی اقدار

انسانی معاشرے میں انتشار اور انارکی کی بنیادی وجہ روحانی اقدار سے پہلوتہی ہے۔ بڑے بڑے بین الاقوامی تنازعات روحانی نظام سے رُوگردانی کے باعث جنم لیتے ہیں۔ صحیح روحانی نظام ترغیبات نفس کے منفی اثرات سے بچاؤ کا سامان مہیا کرتا ہے اور یہی کسی شائستہ تہذیب کی اصل بنیاد ہے۔

متقین ایمان بالغیب سے آراستہ ہوتے ہیں۔ قرآن میں یہ نکتہ وضاحت سے بیان ہوا ہے کہ انکار کرنے والا متقی نہیں ہو سکتا (المزمل ۷۳:۱۷)۔ روحانی اوصاف کے باب میں یہ آیت کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ محض اللہ پر ایمان لانے والا ہی خدا خوف ہو سکتا ہے۔ متقین نشانیوں کی طلب سے گریز کرنے والے، کلام الٰہی میں ذرہ برابر شک نہ کرنے والے، اللہ کی طرف رجوع کرنے، شرک سے بچنے، راتوں کو تلاوت و سجدہ کرنے والے، نیکوکار، رات کو کم سونے والے، وقت سحر استغفار کرنے والے ہوتے ہیں۔ شیطان کے وساوس سے خطرہ لاحق ہو تو اللہ کی یاد میں لگ جاتے ہیں اور راہ یاب ہو جاتے ہیں۔ اپنی ذات کو برائی کے سامنے سرنگوں نہیں کرتے۔ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، صبر سے کام لیتے ہیں، حسد سے بچتے ہیں۔ وہ نیاز محض اللہ کی خاطر دیتے ہیں اور اس طرح شرک کی کسی ادنیٰ سی صورت سے بھی احتراز کرتے ہیں۔ روزے کا اہتمام کرتے ہیں اور قیام صلوٰۃ اور ایتاے زکوٰۃ پر کاربند ہوتے ہیں (البقرہ ۲:۳، ۲۴، ۴۵، ۸۳، آل عمران ۳:۱۱۵، ۱۱۹، الاعراف ۷:۹۶، ۱۵۶، ۲۰۱، الذریٰت ۵۱: ۱۵، المائدہ ۵: ۲۷، النحل ۲:۱۶)۔ شعائر اسلامی کا احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔ ان کی توہین گناہ کبیرہ ہے۔ رب کے غضب سے ڈرنے کے ساتھ پیغمبروں کے معجزات پر یقین رکھتے ہیں۔ طاغوت کی بندگی سے اجتناب کرنے والے اور ہمہ تن اللہ کی طرف متوجہ رہنے والے ہوتے ہیں۔ جو بات کو کان لگا کر سنتے ہیں اور احسن، یعنی بہترین بات کا اتباع کرتے ہیں۔ عہد الست کا پاس کرتے ہیں جو عالم ارواح میں ہر بندے نے اپنے رب کے

ساتھ کیا۔ قرآن میں آتا ہے کہ مسجد حرام کی بنیاد تقوی پر ہے اور اس میں طاہر لوگوں کا ورود ہوتا ہے۔ لہٰذا طہارت بھی شعارِ تقویٰ ہے۔ (النحل ۱۶: ۲' الحج ۲۲: ۳۲' آل عمران ۳: ۵۰' الزمر ۳۹: ۱۶' التوبہ ۹: ۱۰۹' المائدہ ۵: ۱۱۰)

شمع توحید کے یہ پروانے اللہ کا قرب تلاش کرتے ہیں' رب کی مغفرت کی طرف سرعت سے دوڑتے ہیں' گذشتہ قوموں کے انجام سے عبرت پکڑتے ہیں اور اللہ اور رسولؐ کی فرماں برداری کرتے ہوئے اپنی اصلاح کر لیتے ہیں۔ حلال و مرغوب چیزوں سے استفادہ کرتے ہیں' مگر دنیا کی زینت پر آخرت کے اعلیٰ مقام کو ترجیح دیتے ہیں۔ تزکیہ نفس کا اہتمام کرنے والے ہیں اور اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ روز آخر کے لیے اعمال کا کیا ذخیرہ کیا ہے (آل عمران ۳: ۴۵' ۱۳۱' البقرہ ۲: ۲۱۲' الاعراف ۷: ۲۵' یوسف ۱۲: ۱۰۹' النور ۲۴: ۵۲' الشمس ۹۱: ۸' الحشر ۵۹: ۱۸)۔ خالصتاً اللہ کی رضا اور پاکی حاصل کرنے کے لیے اللہ کی راہ میں کھلے دل سے خرچ کرتے ہیں۔ یہ محض رضاے الٰہی کے لیے ہوتا ہے کسی کا ان پر احسان نہیں کہ بدلہ چکایا جائے (محمد ۴۷: ۳۶' الیل ۹۲: ۵' ۱۷)۔ حج و عمرہ کو اللہ تعالیٰ کے لیے پورا کرنے اور حالت احرام میں خشکی کے شکار سے اجتناب کرنے والے' دوران حج جنسی میلان و اختلاط اور لڑائی جھگڑے اور نزاع سے بچنے والے ہوتے ہیں۔ ایام تشریق میں منیٰ کے میدان میں اللہ کی یاد میں قیام کرنا بھی شعارِ تقویٰ ہے (البقرہ ۲: ۱۹۶' ۱۹۷' ۱۹۸' المائدہ ۵: ۹۶)۔ حج کے اخروی ایام میں طواف زیارت سے فراغت کے بعد عام طور سے عجلت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس موقع پر مکہ سے لوٹ کر منیٰ میں قیام تقویٰ کا بھرپور تقاضا ہے۔

ایمان و عمل صالح پر کاربند ان لوگوں پر اگر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جائے تو یہ نیکی و صبر سے بڑھ کر اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ جان و مال کی آزمایش اور کفار کی طرف سے دکھ دینے والی باتوں پر صبر کرتے ہیں' اس کے مقابلے میں بردباری کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے اخلاقی معیار کو قائم رکھتے ہوئے احسن طریقے پر استدلال کے ساتھ اس پروپیگنڈے کی نفی کرتے ہیں اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے ہیں (ص ۳۸: ۲۸' آل عمران ۳: ۱۸۶)۔ یہ ایک غیر معمولی نکتہ ہے جس کا ہم صحیح معنوں میں ادراک نہیں کرتے حالانکہ یہ اللہ کا خصوصی فضل ہے کہ مسلمان دشمن کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہیں۔ ایسی حکمت عملی اختیار کرنا جس سے جنگ کو روکا جا سکے اور دشمن کے وار سے بچا جا سکے انتہائی مستحسن ہے۔ اگر امان میسر آجائے تو قرآن ایسی صورت میں ہمیں پرہیزگاری اختیار کرنے کا درس دیتا ہے۔ اس فرصت کو لہو و لعب میں ضائع کرنے کے بجائے اسے غنیمت جان کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے اندر مزید قوت اور مضبوطی

پیدا کرنی چاہیے۔ متقین کی ایک اور اہم خوبی یہ ہے کہ وہ مرتے دم تک ایمان پر قائم رہتے ہیں۔ (ال عمران ۳:۱۰۲)

حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص عمر کے بیشتر حصے میں راست بازی کی زندگی گزارتا ہے مگر آخری حصے میں ایمان و ایقان اور صبر واستقامت سے دامن چھڑا کر ضلالت وعصیاں کی راہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس کے سارے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں اور وہ انجامِ بد سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ اہل تقویٰ کی خداخوفی انھیں تادم حیات معیارحق پر قائم ودائم رکھنے میں معاون ہوتی ہے۔

ذاتی و اخلاقی اوصاف

انسان کا اخلاق اس کے باطن کا مظہر اور اس کی روحانی اقدار کا پرتو ہوتا ہے۔ معاشرے میں انسان کی وقعت اور مقام و مرتبے کا اس کے اخلاق سے گہرا تعلق ہے۔ حضورؐ کے بارے میں قرآن میں آتا ہے کہ آپؐ مکارمِ اخلاق کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں۔ نبوت سے پہلے ہی آپؐ صادق وامین کے لقب سے مشہور تھے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ اگر آپ تندخو اور درشت رو ہوتے تو یہ لوگ آپؐ کے گرد وپیش سے چھٹ جاتے اور آپؐ آفاق وانفس کی ساری دولت خرچ کر کے بھی انھیں اکٹھا نہ رکھ سکتے۔ یہ آپؐ کے اخلاق حمیدہ ہی کا کرشمہ ہے کہ ایک جھگڑالو قوم کو آپؐ نے باہم شیروشکر کر دیا۔ بنی اسرائیل کو تقویٰ کی ترغیب اور احکامِ خداوندی کا ذکر ان الفاظ میں ہوتا ہے: باطل کا رنگ چڑھا کر حق کو مشتبہانہ بناؤ، دنیوی فائدہ حاصل کرنے کے لیے ایمان تک کا سودا نہ کر ڈالو، کتمان حق سے بچو اور ایسا نہ ہو کہ دوسروں کو نیکی کا حکم دو اور خود اس سے اعراض برتو اور اس طرح دوسروں کو نصیحت اور خود کو فضیحت بننے کی عملی تصویر بن جاؤ۔ عہد و پیمان کا پاس کرو اور کلام الٰہی کو مضبوطی سے تھامو، مکافاتِ عمل سے ڈرو، جادوٹونے سے اجتناب کرو (البقرہ ۲: ۴۱-۴۵، ۶۳، ۶۶)۔ تقویٰ کا تقاضا ہے کہ انسان تنگ دستی اور دکھ درد میں صبر کرے، راہ راست پر رہتے ہوئے قول وقرار کو پورا کرے، تکبر وتعصب سے اجتناب کرے۔ بدلے میں زیادتی نہ کرے، حد سے تجاوز نہ کرے اور ظلم اور زیادتی کرنے کے لیے اللہ کے احکام کو ہنسی کھیل نہ بنائے (البقرہ ۲: ۱۰۲، ۱۹۴، ۲۰۷، ۲۳۱)۔ قرآن میں ایک اور جگہ آتا ہے کہ اغیار کی دشمنی میں اللہ کا خوف رہے اور کسی قوم کی عداوت میں بھی عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ یہ آیت بڑے سے بڑے ظالم کے لیے اپنے اندر ہدایت کا سامان رکھتی ہے۔ (ال عمران ۳: ۷۶، ۱۱۵، المائدہ ۵: ۸۰)

اہل تقویٰ بدگمانی نہ کرنے والے، بھید نہ ٹٹولنے والے، غیبت سے احتراز کرنے والے، لہو ولعب سے کنارہ کشی کرنے والے اور اگر لغو چیز پر سے گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح دامن الجھائے بغیر

گزر جانے والے ہیں۔ وہ بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے بچنے والے ہوتے ہیں۔ وہ بدکاری سے دُور رہتے ہیں اور کسی کو رسوا نہیں کرتے۔ اہل تقویٰ قوتِ فیصلہ اور اصابت رائے رکھنے والے نرم دل اور والدین کے حق شناس ہوتے ہیں (الحجرات ۴۹:۱۲' النجم ۵۳:۳۲' الحدید ۵۷:۲۸' الانعام ۶:۳۲' الفرقان ۲۵:۲۴' الحجر ۱۵:۶۹' مریم ۱۹: ۱۳۶)۔ قول سدید' یعنی سیدھی سچی بات کرنا' نیک بات کی تصدیق کرنا اور سچے لوگوں کا ساتھ دینا ان کا شعار ہوتا ہے۔ دشمنوں کی پشتیبانی سے باز رہتے ہیں۔ مومنوں کی بھلائی سے خوش اور برائی سے ناخوش' خیراندیش نہ کہ بدخواہ' دو بھائیوں میں صلح کرانے والے' دگرگوں حالت میں اللہ کی مدد حاصل کرنے کے بعد اس کا شکر ادا کرنے والے' آسانی وسختی میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے' غصہ پی جانے والے' اور عفو و درگزر کرنے کے ساتھ احسان کی روش اختیار کرنے والے ہوتے ہیں۔ فحش کلام اور جانوں پر ظلم کرنے کے بعد اللہ سے رجوع اور استغفار کرتے ہیں اور برے کام پر اڑ نہیں جاتے (التوبہ ۹: ۱۱۹' الاحزاب ۳۳:۱۰' الیل ۹۲: ۵' التوبہ ۹: ۴' ال عمران ۳:۱۲۰' ۱۲۳' ۱۳۱' ۱۳۵' الحجرات ۴۹: ۱۰)۔ اہل تقویٰ کے اخلاقِ عالیہ کا اندازہ اس آیت سے لگایئے "یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لانے کے بعد اللہ کے راستے میں زخم کھانے کے باوجود احسان کی روش اختیار کرتے ہیں (ال عمران ۳:۱۷۳)۔

ازدواجی زندگی

ازدواجی زندگی کے باب کا عنوان سورہ فرقان کی یہ دعا ہے: "اے ہمارے رب' ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے اور ہم کو پرہیزگاروں کا امام بنا" (الفرقان ۲۵: ۷۴)۔ اگر اہل وعیال آنکھوں کی ٹھنڈک نہ بنیں تو رشتہ ازدواج اور خاندان' لایعنی ہو کر رہ جائیں گے۔ آیت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دعا کا مستجاب ہونا بھی تقویٰ پر منحصر ہے۔ ہمارے معاشرے میں خواتین کے ساتھ عام طور سے جو ظلم روا رکھا جاتا ہے اس کی بنیادی وجہ ازدواجی احکام سے روگردانی ہے۔ رسول کریمؐ نے اپنے آخری خطاب میں بھی فرمایا: خواتین تمھارے پاس ایک خوب صورت اور نازک امانت ہیں۔ ازدواجی زندگی کے سلسلے میں دیگر ترغیبات جنھیں محاسن تقویٰ کے طور پر بیان کیا گیا درج ذیل ہیں:

زوجین سے حتی الوسع عدل واحسان کی روش اختیار کرنا' عورتوں کے مہر خوش دلی سے ادا کرنا' صلح و آشتی سے رہنا' دل تنگ نہ کرنا' اور آپس میں حسن سلوک کا مظاہرہ کرنا' بیویوں کو اچھی طرح بسانا' ناچاقی کی صورت میں تکلیف پہنچانے کی غرض سے نہ روکے رکھنا (البقرہ ۲:۲۳۱' النساء ۴: ۱۲۸' ۱۲۹)۔ صحبت زوج میں اخلاقی قواعد وضوابط کی حد بندی قائم رکھنا' حرام اور بے حیائی سے بچنا' نیک اعمال آگے بھیجنا' خصوصاً اولاد کی نیک تربیت کرنا' مباشرت برائے اولاد' روزے کی حدود کا خیال اور دوران اعتکاف جنسی میلان واختلاط

سے پرہیز کرنا (البقرہ ۲:۱۸۷' ۲۲۳)۔عورتوں کے طلاق کے معاملات میں حکم خداوندی کی پیروی کرنا۔ اگر صلح جوئی کی کاوشوں کے باوجود زوجین کے مابین اللہ کی حدود کے مطابق زندگی گزارنے پر رجوع نہ ہو سکے تو مطلقہ عورتوں سے نہ صرف خیراندیشی کا رویہ رکھا جائے بلکہ انھیں فائدہ دینے کی روش اختیار کرنی چاہیے' مثلاً جدائی ہونے کے باوجود رضاعت کی مدت میں نان نفقے کا اہتمام کرنا۔

آپس کے جھگڑے کو اولاد کی وجہ سے انگیخت نہ کرے' یعنی کسی بھی فریق کو اولاد کو اپنے مفاد اور فریق ثانی کو ضرر پہنچانے کی غرض سے استعمال نہ کرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں عورت کو ہاتھ لگانے سے پہلے جدائی ہونے کی صورت میں نصف مہر کی قانونی چھوٹ کے باوجود فیاضی کا برتاؤ کرنا اور پورا مہر ادا کرنا (البقرہ ۲:۲۳۳' ۲۳۷' ۲۴۱' الطلاق ۶۵: ۴۵)۔ زوجین کو آپس میں کشادہ دلی اور فیاضی طبع کا درس دیا جارہا ہے' اس لیے کہ دل تنگی کی طرف جلدی سے مائل ہو جاتے ہیں۔ عموماً چھوٹے چھوٹے معاملات پر ناچاقی دلوں کی تنگی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اہل تقویٰ اپنے آپ کو نفس کی تنگی سے بچا کر رکھتے ہیں۔

سماجی و سیاسی اقدار

موجودہ دور کا انسان ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں ایک طرف مادی ترقی اپنے عروج کو پہنچ رہی ہے' فاصلے سمٹ رہے ہیں اور ذرائع مواصلات و ابلاغ نے حقیقتاً دنیا کو ایک عالمی قریہ بنا دیا ہے' تو دوسری جانب انسانی تہذیب سماجی رذائل کے اُمڈتے ہوئے سیلاب کے آگے دم توڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مل جل کر رہنے کے کسی آفاقی عادلانہ نظام کی عدم موجودگی کی وجہ سے اس عالمی قریے میں فساد برپا ہے۔

عدل' اسلامی سماجی اقدار کا روح رواں ہے اور یہ تقویٰ سے عبارت ہے۔ قرآنی آیت ''عدل کرو' یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے'' اسی حقیقت کی ترجمانی ہے۔ سورہ حدید میں نظام عدل وقسط کے قیام کو انبیا و رسل کی وجہ بعثت قرار دیا گیا مگر اس کا حصول چند بنیادی خوبیوں کا تقاضا کرتا ہے جسے قرآن متقین کے ساتھ جوڑتا ہے' مثلاً تعصب سے اجتناب اور ذاتی مفاد سے گریز' نہ صرف سچی گواہی دینا بلکہ جھوٹی گواہی کا توڑ بھی سچی گواہی سے کرنا۔ یہاں معاشرے کی ابتری کا یہ حال ہے کہ سچی گواہی کے لیے آنے والوں کو عدالت کے احاطے میں گولیوں سے بھون دیا جاتا ہے۔

سورہ حجرات میں آتا ہے کہ اللہ اور رسولؐ سے آگے نہ بڑھنا شعار تقویٰ ہے۔ اسی روش کو سوسائٹی کا شعار ہونا چاہیے۔ معاشرہ اپنے کسی معاملے میں اللہ اور رسولؐ کے دیے ہوئے احکام وفرامین اور حدود سے تجاوز نہ کرے تو صحیح معنوں میں عدل کے تقاضے پورے ہو سکتے ہیں۔ عدل کرنا چاہیے' خواہ معاملہ قرابت

دار کا ہی کیوں نہ ہو۔ قرآن کی رو سے جس چیز سے رسولؐ روکیں رک جایئے اور جو رسولؐ عطا کریں قبول کرلیجیے۔ (الحجرات ۴۹:۱' الحشر ۵۹:۷)

سماجی اعتبار سے قرآن نے اہل تقویٰ کے یہ نمایاں اوصاف بیان کیے ہیں: لوگوں سے خوف نہ کھانا بلکہ اللہ سے ڈرنا' اللہ کا زیادہ حق ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔ اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑنا اور باہم اختلاف نہ کرنا' حقوق العباد میں بدرجہ اولیٰ قطع رحمی سے بچنا' یتیموں کے مال لوٹانا اور ان میں گھپلے سے باز رہنا' بھلائی کی طرف بلانا اور برائی سے روکنا (الاحزاب ۳۳: ۳۷' اٰل عمران ۳: ۱۰۲' ۱۰۵' النساء ۴: ۱' ۳-۶)۔ ایک اور جگہ پر آتا ہے کہ ''تم ایسے وبال سے ڈرو کہ جو خاص انھی لوگوں پر واقع نہ ہوگا جو تم میں سے ان گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں'' (الانفال ۸: ۲۵)۔ یہ آیت تقویٰ کا تعلق براہ راست نہی عن المنکر سے قائم کرتی ہے' یعنی یہ وبال اُنھیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گا جو محض انفرادی نیکی پر قانع ہو کر گوشۂ عافیت میں جاگزیں ہوگئے ہیں اور اجتماعی برائیوں سے روکنے سے کنارہ کش ہوگئے ہیں۔ متقین صحیح ترازو سے تولنے والے اور زمین میں شر و فساد نہ پھیلانے والے ہیں اور قتل ناحق سے بچتے ہیں۔ اہل ایمان کے لیے قصاص میں زندگی ہے اور اس پر عمل کرنا تقویٰ ہے۔ والدین و رشتہ داروں کے لیے بھلائی کی وصیت کرنا اور وصیت کے معاملے میں تعصب سے اجتناب اور ذاتی مفاد سے گریز کرنا چاہیے۔ قرآن حمیت جاہلیہ کے مقابلے میں تقویٰ کا تصور پیش کرتا ہے۔ حمیت جاہلیہ کا مظاہرہ عزت کے قتل کی صورت میں اکثر ہمارے معاشرے میں سامنے آتا ہے۔ تقویٰ اس برائی کا تریاق ہے (الحدید ۵۷: ۲۸' البقرہ ۲: ۱۷۹' ۱۸۰' الفتح ۴۸: ۲۶' الشعراء ۲۶: ۱۸۴)۔ گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے اجتناب بھی تقویٰ ہے' جب کہ ہمارے ٹی وی چینل پر ہندو عریاں کلچر اور دیگر اخلاق باختہ پروگرام پیش کر کے دولت سمیٹنے والے ارباب بست و کشاد نوجوان نسل کے اخلاق کو برباد کرنے میں مصروف ہیں۔

اپنے پیش رو اہل کتاب میں سے جنھوں نے دین کو مذاق اور تفریح کا سامان بنا لیا ہے ان سے دوستی نہ کرنا اور نہ دوسرے کافروں سے ہی دوستی کرنا' اللہ کی اطاعت کرنا اور ان بے لگام لوگوں کی اطاعت سے گریز کرنا جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں' اصلاح نہیں کرتے' متقین کا شیوہ ہے۔ ان کا یہ فعل طاغوت سے بغاوت اور اللہ کی بندگی سے عبارت ہے۔ متقین کی ایک اور اہم سماجی قدر یہ ہے کہ وہ خبث کی کثرت کے باوجود خبیث اور طیب میں تمیز کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہ وصف مادر پدر آزاد جمہوریت کی نفی کرتے ہوئے جمہوریت کے عمل کو اخلاقی قواعد و ضوابط کا پابند کرتا ہے (المائدہ ۵: ۵۷' ۶۵' الشعرا ۲۶: ۱۵۱-۱۵۲' المائدہ ۵: ۱۶۰)۔ نیکی اور بندگان خدا کی بھلائی میں رکاوٹ سے بچتے ہیں (البقرہ ۲: ۲۴۰)۔ اس خوبی کے

حامل بھی وہی افراد ہو سکتے ہیں جو اجتماعی مفاد کو ذاتی مفاد پر عملاً ترجیح دیتے ہوں۔

حربی و جہادی اوصاف

جہاد کا مقصد فتنہ و فساد کا قلع قمع اور دین اسلام کی سربلندی ہے۔ بہ الفاظ دیگر انصاف کا قیام اور تمام انسانوں کے لیے آزادی' عزت اور عدل کا حصول ہے۔ آج اغیار' جہاد کو دہشت گردی سے موسوم کر کے اس اعلیٰ مقصد کی تحقیر کرنے میں کوشاں ہیں حالانکہ وہ خود انتہائی مہلک ہتھیاروں سے مسلح دنیا کے ہر کونے میں اُمت مسلمہ کے خلاف اپنی پوری عسکری قوت کے ساتھ برسرِ پیکار نظر آتے ہیں۔

فرمان خداوندی ہے' اللہ کا قرب تلاش کرو اور اس کی راہ میں جہاد کرو تو فلاح و کامرانی پاؤ گے (المائدہ ۵: ۳۵)۔ اہل تقویٰ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ لڑائی میں صبر کرنے والے ہیں اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ کافروں کو دیکھ کر ان کے دل اور بڑھ جاتے ہیں اور اللہ ان کے لیے کافی ہوتا ہے (البقرہ ۲: ۱۷۷' آل عمران ۳: ۱۷۱-۱۷۳)۔ مشرکوں سے متحد ہو کر جنگ کرتے ہیں۔ انکارِ حق کے مجرم ان میں سختی پاتے ہیں۔ ایسے عناصر کا پوری طرح قلع قمع کرتے ہیں جو آس پاس ہوں (التوبہ ۹: ۱۲۳)۔ اہل تقویٰ کے لیے جہاد کے باب میں قاطع آیت تو سورۃ النساء (۴: ۷۷) میں آئی ہوئی ہے۔ اس کی رُو سے دورِ مکہ میں ہاتھ باندھ کر تربیت حاصل کرنے والے' نماز و زکوٰۃ کی پابندی کرنے والے' لومۃ لائم اور مصائب کو برداشت کرنے والے' تقویٰ کے انتہائی معیار سے دُور پائے گئے۔ مکی دور کی یہ آزمایشیں اور صعوبتیں تو کفر کے مقابلے میں جہاد و قتال کی تیاری تھی۔ جب جنگ کا مرحلہ آتا ہے تو جن کے دل میں نفاق کی بیماری ہے وہ لوگوں سے اس طرح ڈرنے لگتے ہیں جیسے اللہ سے ڈرنے کا حق ہے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ' اور زندگی کی مہلت مانگنے لگتے ہیں۔ اس مقام پر واضح کیا گیا کہ دنیا کا نفع تو کم ہے اور متقیوں کے لیے آخرت ہی بہتر ہے۔ متقین جہاد میں دلیری اور بسالت کا مظاہرہ کرنے والے ہیں۔ (النساء ۴: ۷۷)

سائنسی و تحقیقی اوصاف

فرمان خداوندی ہے: ''رات دن کے اُلٹ پھیر اور زمین و آسمان کی تخلیق میں پرہیزگاروں کے لیے نشانیاں ہیں''۔ علامہ اقبالؒ اپنے مشہور خطبات میں لکھتے ہیں کہ کائنات میں غور و فکر کرنے والا سائنس دان بھی ایک طرح سے عبادت کرنے والے صوفی کی مانند ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ تمھارے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اس لیے کائنات کی قوتوں کو مسخر کرنا انسانی فریضہ ہے اور کائنات کو جانے بغیر اس کی قوتوں کو مسخر نہیں کیا جا سکتا۔ کائنات اللہ تعالیٰ کی بہت زبردست اور شان دار تخلیق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں تخلیق کائنات کے مراحل بیان فرمائے ہیں' اس کی خوبیاں بیان

فرمائی ہیں اور اس میں کام کرنے والے عناصر کی ترتیب کو واضح کیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جو چیز اتنی منظم اور مربوط ہو' وہ بے مقصد نہیں ہوسکتی بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم حکمت وقدرت اور ربوبیت کارفرما ہے۔ یہ محض کھیل تماشا نہیں!

رب کی ربوبیت تو عیاں ہے۔ آثار کائنات پر غور کر کے متقین اس میں سے حکمت و دانش کے موتی نکالتے ہیں اور اللہ کے قوانین جو پوری کائنات میں نافذ ہیں انھیں معلوم کر کے انسانی فلاح کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ تمام قوانین فطرت کائنات میں پہلے سے موجود ہیں۔ انسان اپنے مشاہدے سے انھیں دریافت کرتا ہے' ان کا عمیق تجزیہ کرتا ہے اور انھیں بروے کار لاتا ہے۔ نیوٹن نے سیب کو زمین کی طرف گرتے ہوئے دیکھا تو کشش ثقل کا قانون دریافت کیا۔ یہ اس کی ذاتی اختراع یا ایجاد نہیں۔ کشش ثقل تو پہلے سے کائنات میں کارفرما تھی' تاہم اس کا مشاہدہ کرنے والا اور اس کا قانون وضع کرنے والا وہ پہلا شخص تھا۔ بعد میں آنے والے سائنس دانوں نے اس قانون کو مرکز گریز (centrifuge) کے آلے کی شکل میں استعمال کیا اور اس سے حاصل ہونے والی مرکز گریز قوت میں کئی گنا اضافہ کر کے زمانے کی بڑھتی ہوئی پیداواری طلب کا ہدف پورا کیا۔ یہی آلہ یورنیم دھات کی افزودگی میں کلیدی حیثیت کا حامل ہے جس سے بالآخر ایٹم بم کا مواد حاصل کیا جاتا ہے۔

آسمان و زمین سے رزق کون دیتا ہے' موت وحیات پر کون قادر ہے' فیصلے کا اختیار کس کو ہے' متقین کبھی ان حقائق سے صرف نظر نہیں کرتے۔ اگر انھیں کوئی فائدہ حاصل ہو تو رب کا شکر بجالاتے ہیں' اتراتے نہیں' اور نہ انھیں ذاتی یا گروہی مفاد کی خاطر ہی استعمال کرتے ہیں۔ اس کے برعکس غیر مسلم سائنس دان قوانین فطرت کو محض ذاتی فائدے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ ان کے مشاہدات ان کو معرفت رب سے آشنا کرتے رہتے ہیں' جب کہ متقین آثار کائنات سے اللہ کی پہچان کرنے والے ہیں۔ (المؤمنون ۲۳:۸۷)

آج اس امر کا ادراک پہلے سے کہیں زیادہ ہے کہ مسلمانوں کو سائنسی علوم میں کاوش کرنی چاہیے۔ وقت کی ٹکنالوجی کو حاصل کرنا چاہیے اور ایجاد و اختراع اور تحقیق و تفتیش کے ذریعے علم اور سائنس پر دست رس اور قدرت حاصل کرنا چاہیے۔ یہ مسلمانوں کی ہی متاع گم گشتہ ہے۔ ان ہی کا میدانِ کار ہے۔ قرآن کی رُو سے تسخیر کائنات بدرجہ اولیٰ نیک لوگوں کا حق ہے ؎

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

کائنات کے خزانوں اور رازوں کو غیروں کے لیے چھوڑ دینا کھلی حماقت ہے۔ مسلمانوں کو علم' قوت اور

وسائل کو غلط ہاتھوں میں مرتکز ہونے سے بچانا چاہیے۔

معاشی و اقتصادی اوصاف

یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ تعلیم، صنعت وحرفت، دفاع اور رفاہ عامہ کے کاموں کے لیے کسی بھی ملک کی معاشی قوت مرکزی کردار ادا کرتی ہے۔ قرآن مسلمانوں کو عسکری قوت بہم پہنچانے کی مد میں خرچ کرنے کی پُرزور ترغیب دیتا ہے (الانفال ۸: ۶۰)۔ ظاہر ہے کہ ایک مضبوط معاشی اساس کے بغیر یہ محال ہے۔ معاشی و اقتصادی میدان میں لین دین اور دیگر معاشی عناصر کی بابت اہل تقویٰ کے حوالے سے قرآن میں مندرجہ ذیل خصوصیات کا ذکر ملتا ہے۔

اہل تقویٰ اپنے مال سامانِ زیست کے لیے دانش مندی سے استعمال کرتے ہیں۔ وراثت کی تقسیم میں مساکین و یتامیٰ کا خیال رکھتے ہیں۔ قرض کے معاملے کو لکھنا اور اس سلسلے میں کاتب اور گواہ کو نقصان سے بچانا بھی شعار تقویٰ ہے۔ نہ صرف سود کھانے سے باز رہتے ہیں اور سود کی رقم سے دست بردار ہو جاتے ہیں بلکہ قرض دار کو مہلت دینا اور اس سے بھی افضل یہ کہ عاقبت کی فکر کرتے ہوئے قرض کی رقم صدقہ کر دینا متقین کا شیوہ ہے (النساء ۴: ۹، البقرہ ۲: ۲۷۸، اٰل عمران ۳: ۱۳۰)۔ یہاں سود سے گریز کو تقویٰ سے مشروط کر دیا گیا ہے۔ متقین دولت کو تقسیم کرنے والے ہیں تاکہ مال دولت مندوں کے ہاتھوں میں جمع ہو کر نہ رہ جائے اور چند ہاتھوں میں گردش نہ کرتا رہے (الحشر ۵۹: ۷)۔ تقویٰ یہ بھی تقاضا کرتا ہے کہ رہن شدہ اراضی مالک کو واپس کی جائے اور اس سلسلے میں گواہی کو چھپانے سے گریز کیا جائے۔ (البقرہ ۲: ۲۸۳)

حاصل بحث

تقویٰ ایسی روش کا نام ہے جو اسلام کے پورے اخلاقی، سماجی اور معاشی نظام پر محیط ہے۔ قرآن برائی سے بچنے کی محض تلقین ہی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس سے بچاؤ کے لیے عملی تدابیر بھی تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ تقویٰ کردار سازی اور اصلاح نفس کا اہم ذریعہ ہے۔ اس کی ادنیٰ سی صورت بھی ذاتی حرص اور ترغیبات نفسانی کے منفی اثرات سے بچاؤ کا سامان مہیا کرتی ہے، تاہم قرآن کی رُو سے ذاتی تقویٰ اور زہد و ورع کو علمی، سماجی اور معاشی میدانوں سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ چیز اہل تقویٰ کو مادہ پرستوں پر فضیلت عطا کرتی ہے۔ پرہیزگاری، پاکیزگی، انفاق فی سبیل اللہ، اخلاق حسنہ کے علاوہ کائنات میں غور اور سود سے بچاؤ تقویٰ حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ آج دین و دنیا کے درمیان ایسا آہنگ درکار ہے جو دنیا کو دین کی رہنمائی میں زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھائے۔ مادی اور روحانی تقاضوں میں ایسا توازن ہو کہ انسان استحصالی گورکھ دھندے کا شکار ہوئے بغیر عدل وقسط کے نظام کی فیوض و برکات سے بہرہ مند ہو سکے۔

آج انسانیت جن مسائل سے دوچار ہے' اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کا سبب یہی سامنے آئے گا کہ انسان تقویٰ کی صفات سے محروم ہو گیا ہے۔ مسلمان بھی اسی صورت میں انسانیت کے لیے کوئی نمونہ پیش کر سکتے ہیں اور اس کی قیادت کر سکتے ہیں کہ صرف نام کے مسلمان نہ ہوں' بلکہ تقویٰ کی روش پر چلنے والے ہوں۔ اگر وہ یہ صفات اختیار کریں تو ان کی انفرادی زندگی بھی سکون و برکت کا گہوارا ہو گی اور اجتماعی طور پر بھی مسلمان معاشرے اطمینان وسکون اور عزت اور خوش حالی کے آئینہ دار ہوں گے۔ ہم دوسروں کے لیے نرم چارہ نہ ہوں گے۔ ہماری معیشتیں بیرونی قرضوں کے بندھن سے آزاد ہوں گی۔ ہمارا اتحاد اور ایمانی قوت اور دفاعی اور مادی تیاریاں ایسی ہوں گی کہ دشمن ہماری طرف بری نظر سے نہ دیکھے گا۔ لیکن اس کے لیے اُمت مسلمہ کی عظیم اکثریت کو ایک فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے' اللہ پر ایمان کے دعووں کے ساتھ قرآن کی بیان کردہ اہل تقویٰ کی صفات اپنے اندر پیدا کرے گی۔

تعلیم کا عمل

ہر واقعے سے

ہر لمحے سے

ہر نئے دن سے

اپنوں سے

دشمنوں سے

کامیابیوں سے

ناکامیوں سے

اپنے سے بہتر لوگوں سے

اپنے سے کم تر لوگوں سے

قوی اور اعلیٰ سے

ضعیف اور ادنیٰ سے

—— سیکھتے چلے جانا

تعلیم کا وہ موثر عمل ہے

جس سے زیادہ وسیع اور موثر کوئی عمل نہیں۔ خرم مراد

مختلف مسالک پر عمل

مولانا عبدالمالک

اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ نظام کتاب وسنت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللّٰہ وسنۃ نبیہ (موطا)

میں نے تمھارے پاس دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ جب تک تم انھیں پکڑے رکھو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے: اللہ کی کتاب اور اس کے نبیؐ کی سنت۔

کتاب وسنت ہی دین کا نام ہے اور کتاب وسنت ہی ''حبل اللہ'' ہے' جس کو مضبوطی سے پکڑنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے' فرمایا:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ص (اٰل عمران ۳:۱۰۳)

اور سب مل کر اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑو اور اس سے الگ نہ ہو جاؤ

اس لیے جو شخص کتاب وسنت پر عمل کرتا ہے وہ دین پر عمل کرتا ہے۔ کتاب وسنت سے ہٹ کر کسی بھی مسلک کو اللہ تعالیٰ نے اتباع اور اطاعت کے لیے مقرر نہیں فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اطاعت کے لیے نامزد اور متعین اللہ کے نبی اور وہ دین ہے جو کتاب وسنت کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ قرآن وسنت نے اولی الامر فقہا کی اطاعت کو بھی لازم کیا ہے لیکن وہ اس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ کتاب وسنت کے تابع ہو' اس سے متعارض یا متصادم نہ ہو۔ اگر کتاب وسنت سے متعارض ہو تو پھر فقہا کی نہیں بلکہ کتاب وسنت کی اطاعت کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ج فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ط ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ○ (النساء ۴:۵۹)

اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اس کے رسولؐ کی اور اپنے صاحبِ امر

لوگوں کی، پھر اگر تم کسی معاملے پر جھگڑ پڑو تو اسے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف لوٹاؤ، اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھتے ہو، یہ بہتر اور اچھا ہے انجام کے لحاظ سے۔

اس آیت سے واضح ہو گیا کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ، اولی الامر کی اطاعت بھی لازم ہے لیکن یہ غیر مستقل اطاعت ہے۔ اس سے کتاب و سنت کی روشنی میں اختلاف کیا جا سکتا ہے، آخری فیصلہ کتاب و سنت کا ہوگا۔ کتاب و سنت ہی سپریم لا ہے۔ جہاں تک فقہ اور مسلکوں کا تعلق ہے تو یہ کتاب و سنت کی تفسیر، تشریح اور ان سے استنباط کا نام ہے۔ فقہوں میں سے کسی فقہ اور مسلکوں میں سے کسی مسلک کے بارے میں کوئی آیت یا حدیث نہیں آئی۔ مختلف مسلکوں کے ساتھ جو لوگ وابستہ ہوئے ہیں وہ اس بنا پر نہیں کہ کسی آیت یا حدیث نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے بلکہ فقہا کی تحقیق اور ان کے علم و عمل اور کردار سے متاثر ہو کر لوگ ان کے ساتھ وابستہ ہوئے ہیں۔ گویا مخصوص مسلک یا فقہ سے وابستگی کی اساس کوئی حکم الٰہی نہیں بلکہ فقہا کے دلائل اور عمل سے متاثر ہونا ہے۔

اگر اس بنیاد پر ایک شخص پورے مسلک سے متاثر ہو کر اس سے وابستہ ہو سکتا ہے تو اسی طرح مختلف مسلکوں کے مختلف مسائل کو اسی بنیاد پر اختیار کر سکتا ہے۔ لہٰذا کسی ایک یا چند مسائل میں ایک شخص ایک فقیہ کے دلائل سے متاثر ہو کر ان مسائل میں اس کے ساتھ ہو تو دوسرے مسائل میں دوسرے سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ اس لیے صاحب علم آدمی کے لیے اس بات کا دروازہ کھلا ہے کہ وہ تحقیق کرے، مختلف تحقیقات کا تنقیدی جائزہ لے اور ان میں سے کسی ایک مسئلے میں ایک عالم اور کسی دوسرے مسئلے میں دوسرے عالم کی تحقیق کو ترجیح دے۔ اس لیے کہ ایک عالم کے لیے حکم یہی ہے کہ وہ اپنے علم پر عمل کرے، یہ حکم نہیں ہے کہ وہ اپنے علم کی بجائے دوسرے شخص اور محقق کے علم پر عمل کرے۔

لیکن ایک عام آدمی کے لیے حکم یہ ہے کہ وہ صاحب علم آدمی سے پوچھ کر اس کی رہنمائی اور تعلیم کے مطابق عمل کرے۔ فَسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ (النحل ۱۶:۴۳) ''پس تم ذکر والوں (علما) سے پوچھو اگر خود نہیں جانتے''۔ لیکن اس کے لیے بھی کسی خاص مسلک کے عالم سے رجوع کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ وہ جس عالم پر اعتماد رکھتا ہو اس سے رجوع کرے۔ اس لیے عالم کی طرح ایک عام آدمی بھی اپنے شہر کے مختلف مسالک کے علما سے متاثر ہو سکتا ہے اور مختلف مسائل میں ان کی طرف رجوع کر سکتا ہے اور نیک نیتی سے ان سے استفتا کر کے ان کے فتویٰ پر عمل کر سکتا ہے۔ اصولی بات یہی ہے اور عمل بھی اسی اصول پر ہو رہا ہے۔ لوگ جس عالم کے علم سے متاثر ہوتے ہیں اس کی تقلید کرتے ہیں۔ اگر کوئی عالم کسی مسئلے میں تحقیق کرتا ہے یا کسی کی تحقیق سے متاثر ہو جاتا ہے تو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی

تحقیق اور اپنے ضمیر کے مطابق عمل کرے۔

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے علم وعمل سے صرف ان کی تلامذہ ہی نہیں بلکہ وہ علاقے بھی متاثر ہوئے جن میں یہ ائمہ اور ان کے شاگرد رہتے تھے۔ پورا مشرق امام ابوحنیفہؒ، پورا مغرب (شمالی افریقہ) امام مالکؒ، مصروشام امام شافعیؒ اور حجاز امام احمدؒ بن حنبل سے متاثر ہوگیا اور اسی لیے ان ممالک میں ان کی فقہیں رائج ہوگئیں۔ ایسا قدرتی طور پر ہوا ہے۔ علما اور فقہا کے کسی فیصلے کی وجہ سے نہیں ہوا' نہ کسی میٹنگ میں یہ چیز طے ہوئی ہے کہ ان علاقوں کے سارے لوگ ان کی فقہ کی تقلید کریں اور نہ کسی میٹنگ ہی سے اسے ختم کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے جس بنیاد پر لوگ ایک فقہ اور ایک مسلک سے وابستہ ہوئے اور ہوتے ہیں اسی بنیاد پر وہ اس مسلک کی کسی بات کو چھوڑ کر دوسرے مسلک کی بات کو اپنا سکتے ہیں۔ کسی خاص مسلک کی ایک بات کو کسی بھی صورت میں نہ چھوڑنا' اگرچہ اس کے مقابلے میں دوسری بات پر کتاب وسنت سے واضح دلائل موجود ہوں' کسی بھی صورت میں صحیح نہیں ہے۔ یہ بات کہ کوئی شخص یا مسلک اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں کے لیے مقرر کردہ نہیں ہے' بالکل واضح ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے چار یا پانچ مسلک طے شدہ اور مقرر نہیں ہیں کہ ان سے باہر کوئی نہ جائے۔ ائمہ اربعہ یا امام ابوحنیفہؒ کی تقلید لوگوں نے اپنی آزاد مرضی سے ان کے علم سے متاثر ہو کر اس بنا پر کی ہے کہ یہ اولی الامر کا مصداق ہیں جن کی مشروط اطاعت کا حکم ہے۔ یہ تاثر عارضی نہیں مستقل ہے۔

دنیا بھر کے مسلمان ان چاروں ائمہ کے ساتھ اپنی عقیدت کی وجہ سے وابستہ ہوگئے ہیں' چاروں کے علاوہ باقی ائمہ سے وابستہ لوگوں کی تعداد تھوڑی ہے اور ان چاروں میں سے امام ابوحنیفہؒ کے ساتھ وابستہ مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ لیکن وقتاً فوقتاً ایسے محققین سامنے آتے رہتے ہیں جو حنفی ہوتے ہوئے ایک مسئلے میں تحقیق کرتے ہیں تو امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کو چھوڑ کر اس مسئلے میں کسی دوسرے مسلک یا اپنی تحقیق پر عمل کرتے ہیں۔ یہ وہ بات ہے جس کے جواز پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ علامہ ابن ہمامؒ کے حوالے سے فرماتے ہیں:

> سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایک آدمی کسی معین مسلک کو اختیار کرے تو کیا وہ مسلک اس کے لیے لازم ہو جاتا ہے؟ اس کے جواب میں بعض نے کہا لازم ہو جاتا ہے اور بعض نے کہا کہ لازم نہیں ہوتا اور یہی بات زیادہ صحیح ہے۔ (ردالمختار' ج ۱' ص ۱۱۹' طبع دارالمعرفۃ' بیروت)

اس میں جو چیز منع ہے وہ خواہش نفس کی پیروی ہے کہ جو چیز خواہش نفس کے مطابق ہو یا من پسند ہو اس پر عمل کرے۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ نے تاتارخانیہ کے حوالے سے ابوبکرؒ جوزجانی کا ایک فتویٰ

نقل کیا ہے جو مذکورہ بالا اصول کے بارے میں مضبوط دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذیل میں علامہ شامیؒ کی عبارت کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔

تاتارخانیہ میں ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ ابوبکرؒ جوز جانی کے زمانے میں ایک حنفی المذہب شخص نے ایک اہل حدیث آدمی کو اس کی لڑکی کے بارے میں نکاح کا پیغام بھیجا۔ اس نے پیغام کو منظور نہ کیا اور کہا کہ اگر تم اپنا حنفی مذہب چھوڑ کر اہل حدیث کا مسلک قبول کرو گے تو پیغام منظور ہے' چاہو تو قرات خلف الامام اور رفع یدین پر عمل کرو۔ چنانچہ حنفی نے ایسا کرلیا اور نکاح ہو گیا۔ ابوبکرؒ جوز جانی سے جب اس واقعے کے متعلق سوال کیا گیا تو تھوڑی دیر تک خاموشی اختیار کرنے کے بعد فرمایا کہ نکاح تو جائز ہے مگر مجھے اس شخص کے بارے میں خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ کہیں نزع کے وقت اس کا ایمان سلب نہ ہو جائے' کیونکہ اس نے اس مسلک اور مذہب کو چھوڑا جو اس کے نزدیک حق تھا اور مردار گندی دنیا کی خاطر اس نے حق مذہب کی توہین کر ڈالی۔ البتہ کوئی شخص اگر اپنے اختیار کیے ہوئے مذہب کو اجتہاد صحیح کی بنا پر چھوڑ دے تو یہ ایک نیک اقدام ہے اور ایسا کرنے والا اللہ کے پاس سے اجر کا مستحق ہوگا۔ لیکن دلیل کے بغیر محض دنیوی لالچ اور نفسانی خواہش کی خاطر کوئی شخص ایک مسلک سے دوسرے مسلک کی طرف منتقل ہو تو یہ یقیناً بری چیز' گناہ کا کام اور لائق تعزیر جرم ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسے امر کا ارتکاب ہے جو دین میں منکر ہے اور اسی میں دین کا استخفاف اور مذہب کے ساتھ کھلا مذاق ہے۔ (ردالمختار' ج ۶' ص ۱۲۸' مطلب فیما ارتحل الی غیر مذہبہ باب فی التعزیر' کتاب الحدود)

علامہ شرنبلالیؒ ایک مسلک سے دوسرے مسلک کی طرف منتقل ہونے کے جواز کی مثالیں بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ ہم نے جو مثالیں دی ہیں ان سے درج ذیل حقیقتیں واضح ہوتی ہیں:

۱- انسان پر متعین مسلک کو اختیار کرنا لازم نہیں ہے۔

۲- آدمی اپنے مسلک کے خلاف دوسرے مسلک کی تقلید میں اس کے مسائل پر عمل کر سکتا ہے' بشرطیکہ اس مسلک کی تمام شرطوں کی رعایت کرے۔

۳- وہ دو مختلف واقعات میں دو مختلف اور متضاد احکام پر عمل کر سکتا ہے' ایک واقعے میں ایک مسلک پر اور دوسرے واقعے میں دوسرے مسلک پر۔

۴- جو عمل اس نے سابق امام کی تقلید میں کیا ہے اسے دوسرے امام کی تقلید کے بعد باطل نہیں کیا جا سکتا۔ جو نماز شافعی مسلک کے مطابق پڑھی حنفی مسلک اختیار کرنے کے بعد اس کی قضا نہیں کرے گا۔

۵- عمل کرنے کے بعد دوسرے مسلک کی تقلید کی جا سکتی ہے' مثلاً ایک شخص نے اس خیال سے نماز پڑھی کہ میرے اپنے مسلک و مذہب میں صحیح ہے۔ پھر اسے معلوم ہوا کہ مجھے غلطی لگی ہے' یہ نماز میرے مذہب و مسلک میں صحیح نہیں ہے۔ البتہ ایک دوسرے مذہب کے مطابق صحیح ہے تو اس کے لیے جائز ہے کہ دوسرے مسلک و مذہب کی تقلید کرتے ہوئے اسے صحیح سمجھے اور اسی پر اکتفا کرے اور نماز کا اعادہ نہ کرے۔ چنانچہ بزازیہ میں امام ابویوسفؒ سے مروی ہے کہ انھوں نے ایک دفعہ حمام کے پانی سے غسل کر کے جمعہ کی نماز پڑھی۔ بعد میں ان کو بتایا گیا کہ حمام کے کنویں میں چوہا گر کر مر گیا تھا۔ آپ نے فرمایا کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم اپنے مدنی بھائیوں کے قول پر عمل کرتے ہیں کہ جب پانی دو مٹکوں تک پہنچے تو نجس نہیں ہوتا۔ (ردالمختار' ج ۱' ص ۷)

علامہ شرنبلالیؒ کے قول سے تین باتیں واضح ہوئیں۔ ایک یہ کہ لازم صرف یہ ہے کہ عمل کسی مجتہد امام کی پیروی میں کیا جائے' خواہ کوئی بھی ہو۔ دوسرا یہ کہ جس طرح کلی طور پر ایک مذہب و مسلک سے دوسرے مذہب و مسلک کی طرف انتقال جائز ہے اسی طرح جزوی طور پر بھی بعض مسائل میں انتقال کی شرائط کو ملحوظ رکھ کر جائز ہے۔

ابن ہمامؒ فرماتے ہیں ''اگر کوئی شخص ایک متعین مذہب کو اختیار کرے خواہ وہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب ہو یا کسی دوسرے کا' تو آیا ہمیشہ اس پر قائم رہنا بھی واجب ہے؟ بعض کہتے ہیں کہ واجب ہے اور بعض کہتے ہیں کہ نہیں' کیونکہ واجب وہی چیز ہوتی جو خدا نے واجب کی ہو اور خدا نے کسی شخص پر یہ واجب نہیں کیا کہ وہ کسی مذہب کے ساتھ ہمیشہ لازم رہے گا۔ ابن ہمامؒ نے لکھا ہے کہ میرا رجحان بھی اسی کی طرف ہے کہ استمرار لازم نہیں ہے کیونکہ لزوم کے لیے شرعی دلیل کوئی نہیں'' (مسلم الثبوت' ص ۲۹۲)

صاحب مسلم الثبوت علامہ محب اللہ بہاری کا بھی یہی مسلک ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں: ''اشبہ یہ ہے کہ اگر مذہب کے کسی مسئلے پر اس نے فکر و تامل اور اطمینان قلب سے عمل کیا ہو تو جب تک یہ اطمینان باقی ہو اس سے رجوع نہ کرے' اور دوسرے مسائل میں دوسرے امام کی تقلید جائز ہے اور یہ مختار قول ہے۔ کیونکہ دینی مسائل میں سلف کا طریقہ یہ رہا ہے کہ کبھی ایک عالم اور کبھی دوسرے عالم سے استفتا کر کے اس پر عمل کیا کرتے تھے۔ (مسلم الثبوت' ص ۲۹۲)

فقہا نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ اگر دلیل اور شرعی غرض کی بنیاد پر ایسا ہو تو جائز ہے' اور اگر اپنی اغراض کی خاطر یا مذاہب کے استخفاف اور ان کے ساتھ استہزا کے طور پر ایسا کیا جائے تو ناجائز اور موجب تعزیر ہوگا۔ اسی طرح کی صورتوں کے بارے میں فقہا نے فرمایا: ارتحل الی مذھب الشافعی

یعزر (اگر حنفیت سے شافعیت کی طرف منتقل ہوا تو اسے تعزیری سزا دی جائے گی'')۔ (ردالمختار، ص ۱۲۸، کتاب الحدود، باب فی التعزیر)۔ اسی طرح الرجوع عن التقلید بعدالعمل باطل اتفاقًا وھو المختار فیَ المذاھب (ایک بات پر عمل کرنے کے بعد ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب کو اختیار کیا تو یہ باطل ہے) کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسئلے میں ایک امام کے مسلک کے مطابق عمل کر لیا ہو، اس کے بعد اس مسئلے میں دوسرے مسلک کو اختیار کر لیا ہو تو سابقہ مسلک کے مطابق جو عمل ہوا ہے اسے دوسرے مسلک کے مطابق دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ماضی میں جو سابق مسلک کے مطابق کیا ہے وہ ادا ہو گیا، آیندہ کے لیے نئے مسلک کے مطابق عمل کرے۔ ابوبکرؒ جوزجانی فرماتے ہیں: لو ان رجلاً برئ من مذھبه باجتھاد وضح له محموداً ماجوراً ''اگر کسی شخص پر اجتہاد کی بنا پر ایک بات واضح ہوئی ہو اور وہ اس وجہ سے اپنے فقہی مذہب سے تعلق ختم کرے تو یہ نیک اقدام ہے اور موجب اجر کام ہے''۔ (ایضاً)

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں: اذا کان ارتحاله لا لغرض محمود شرعًا ''یعنی انتقال موجب تعزیر جرم اس وقت ہوگا، جب کہ وہ اچھی دینی غرض کے لیے نہ کیا گیا ہو''۔ اسی طرح ایک ہی عمل میں دو ایسی چیزیں جمع ہو جائیں کہ اس کے نتیجے میں وہ عمل کسی کے نزدیک بھی صحیح نہ ہو، تلفیق ہے۔ اگر ایک آدمی نے پورے سر کا مسح نہیں کیا بلکہ اس کے ایک حصے کا کیا، اور اس مسئلے میں امام شافعیؒ کے مسلک کو لیا اور وضو کتے کے جھوٹے پانی سے کیا اور اس مسئلے میں امام مالکؒ کے مسلک کی پیروی کی۔ اس طرح وضو دونوں اماموں میں سے کسی ایک امام کے مسلک پر بھی صحیح نہ ہوا۔ امام مالکؒ کے مسلک پر اس لیے نہیں کہ پورے سر کا مسح نہیں ہوا اور امام شافعیؒ کے مسلک پر اس لیے نہیں ہوا کہ کتے کے جھوٹے سے وضو اور مسح کیا جو ناپاک ہے۔ اس وضو کو جائز کرنے کے لیے سر کی مقدار کے مسئلے میں امام شافعیؒ کی، اور پانی کی طہارت و نجاست کے معاملے میں امام مالکؒ کی رائے کو اپنا لیا۔ اس کو فقہی اصطلاح میں تلفیق کہتے ہیں۔ اس لیے ایک مسلک سے دوسرے مسلک کی طرف وہ انتقال جو ایک ہی عمل میں تلفیق اور کئی مسلکوں کے جوڑنے کو مستلزم ہو، ناجائز اور موجب تعزیر ہے۔

اسی طرح ایسے لوگ جن میں اجتہاد کی اہلیت سرے سے نہ ہو، وہ کتاب و سنت کا گہرا اور وسیع علم نہ رکھتے ہوں، ایک مسئلے کی پوری تحقیق نہ کر سکتے ہوں تو ان کے لیے اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ شریعت اور احکام شرعیہ کو اپنی من مانی آرا کا بازیچہ بنائیں۔ یہ کام صرف ایسے ماہرین شریعت کا ہے جنھوں نے علوم عربیہ اسلامیہ میں اہل علم مفسرین و محدثین اور فقہا کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیے ہوں اور علم و فقہ کے ساتھ طویل وابستگی کے نتیجے میں ان میں ملکہ علمیہ اور ذوقِ تحقیق پیدا ہو گیا ہو۔ وہ محض فنی عالم نہ ہوں بلکہ ان میں

للّٰہیت اور تقویٰ کی صفات بدرجہ اتم پائی جاتی ہوں۔ جو استدلال و استنباط میں صلاحیت رکھنے والے ہوں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں علامہ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں: ''جو شخص استدلال کی قدرت رکھتا ہو' بعض علما کہتے ہیں کہ اس پر تقلید مطلقاً حرام ہے' اور بعض کہتے ہیں کہ مطلقاً جائز ہے' اور بعض کے نزدیک صرف بوقت ضرورت جائز ہے' مثلاً وقت میں اتنی گنجایش نہ ہو کہ تحقیق کر کے دلیل سے مسئلہ نکال سکے۔ یہی قول سب سے زیادہ معتمد ہے''۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر تحقیق کی بنیاد پر دوسرے مسلک کی بات کو کوئی آدمی اختیار کرنا چاہے تو اختیار کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ تحقیق کا اہل ہو۔ عام آدمی کسی بھی محقق عالم جس کے علم پر اسے اعتماد ہو' پوچھ کر عمل کر سکتا ہے اگرچہ وہ کسی بھی مسلک سے تعلق رکھتا ہو' جب کہ وہ اپنے علم کے مطابق فتویٰ دے۔ لیکن خواہش نفس کی بنا پر مذاہب کی آسان آسان باتوں کو منتخب کر کے ان کو مسلک بنانا' یا ایک مسلک کو یا مسلک کے کسی مسئلے کو چھوڑ کر دوسرے مسلک کو اختیار کرنا' یا ایک ہی عمل کے بعض مسائل میں کسی ایک فقیہہ اور کسی میں دوسرے فقیہہ کے مسلک کی آڑ لینا' کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔

سیاسی اسلام؟

علامہ یوسف القرضاوی

ترجمہ: محمد ظہیر الدین بھٹی

سیاسی اسلام (political islam) کی اصطلاح دشمنانِ اسلام نے اپنے مذموم مقاصد کی خاطر وضع کی ہے۔ اس کا مقصد اسلام کے حصے بخرے کرنا اور اسے تقسیم کرنا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک اسلام ایک اکائی نہیں --- جیسا کہ اسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے اور ہم مسلمان ایمان رکھتے ہیں --- بلکہ بہت سے ہیں، متعدد و مختلف اسلام۔ کبھی اسلام کو خطوں کے مطابق تقسیم کرتے ہیں: ایشیائی اور افریقی اسلام۔ کبھی اسلام کو زمانوں کے مطابق الگ الگ کیا جاتا ہے: نبویؐ اسلام، خلافت راشدہ کا اسلام، اموی اسلام، عثمانی اور جدید اسلام۔ کبھی اسلام کو قومیتوں کے لحاظ سے بانٹا جاتا ہے: عربی، ہندی، ترکی اور ملیشیائی اسلام وغیرہ۔ کبھی اسے فرقوں کے لحاظ سے تقسیم کیا جاتا ہے: سنی اسلام، شیعی اسلام۔ پھر سنی اسلام کو کئی مزید ٹکڑوں میں اور شیعی اسلام کو بھی اسی طرح کئی ٹکڑوں میں بانٹا جاتا ہے۔ کبھی سیاسی اسلام، روحانی اسلام، زمانی اسلام اور لاہوتی کی ترکیبیں استعمال کی جاتی ہیں۔ معلوم نہیں کہ آیندہ اسلام کی مزید کیا کیا تقسیمیں کی جائیں گی!

سچ تو یہ ہے کہ ایک مسلمان کی نظر میں یہ سب تقسیمیں مسترد کیے جانے کے قابل ہیں۔ مسلمان کے نزدیک اسلام صرف ایک ہے، اس کے سوا کوئی اور اسلام نہیں۔ یہی پہلا اور آخری اسلام ہے، قرآن وسنت کا دیا ہوا اسلام۔ یہی وہ اسلام ہے جسے اُمت کی افضل ترین نسلوں نے، خیرالقرون کے بزرگوں نے، یعنی صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام نے سمجھا۔ یہی صحیح اسلام ہے، کھرا، صاف اور اُجلا اسلام۔ قومیتوں اور فرقوں کی آمیزش سے بالکل پاک۔ فلسفیوں کی آرا و نظریات سے مبرا، جاہلوں اور گمراہوں کی ریشہ دوانیوں سے پاک، بدعات وخرافات سے خالی، ہر قسم کی پیچیدگیوں سے معرا۔

اس حوالے سے کچھ بنیادی امور قابل توجہ ہیں:

اسلام ہوتا ہی سیاسی ہے: اسلام سیاست کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ اس کے لیے غیر سیاسی ہونا،

ناممکن ہے۔ اسلام پوری زندگی کے لیے ہے۔ یہ پوری زندگی کو چلاتا ہے۔ اگر آپ اسلام کو سیاست سے الگ کر دیں گے تو آپ اسے ایک مذہب بنا دیں گے' بودھ مت' عیسائیت یا کسی اور مذہب جیسا۔ مگر یہ اسلام نہیں ہوگا۔ اس کے دو اہم سبب ہیں:

۱- بہت سے ایسے امور جنھیں سیاسی سمجھا جاتا ہے ان کے متعلق اسلام کا موقف واضح اور اس کا حکم صریح ہے۔ اسلام کوئی لاہوتی عقیدہ نہیں ہے۔ یہ محض پوجا پاٹ کے کچھ طریقوں کا نام نہیں ہے' یعنی یہ محض انسان اور اس کے رب کے مابین کسی پرائیویٹ تعلق کا نام نہیں جس کا زندگی کی تنظیم' معاشرے اور ریاست کی راہ نمائی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ بالکل نہیں۔ اسلام عقیدہ اور عبادت ہے' اخلاق اور کامل شریعت ہے۔ بالفاظ دیگر' یہ زندگی کا مکمل و کامل نظام ہے۔ اسلام فرد کی زندگی' خاندان کے معاملات' معاشرے کے حالات' ریاست کی بنیادوں اور دنیا کے تعلقات کے بارے میں مبادی و قواعد' اصول وضوابط اور قانون سازی و راہ نمائی کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔

جس شخص نے قرآنِ کریم' سنت مطہرہ اور فقہ اسلامی کی کتابیں پڑھی ہیں' اسے یہ بات بالکل واضح طور پر معلوم ہے۔ فقہ میں عبادات تک کا شعبہ بھی ''سیاست'' سے الگ نہیں۔ مسلمانوں کا اس امر پر اتفاق ہے کہ نماز ترک کرنا' زکوٰۃ نہ دینا' رمضان میں دن کے وقت برسرِ عام کھانا پینا' فریضہ حج میں لاپروائی کرنا ایسی حرکات ہیں جن پر حکومت قانون کے تحت سزا دیتی ہے' اور اگر کوئی طاقت ور مسلح جتھہ ان فرائض یا ان میں سے کسی ایک کی بجا آوری میں کوتاہی کرے تو اس کے خلاف لڑائی کی جاتی ہے' جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف کی تھی۔

علماے اسلام نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اگر کسی شہر کے مسلمان ایسی سنتیں چھوڑ دیں جو اسلام کے شعائر میں سے ہیں' جیسے اذان' ختنہ' نمازِ عیدین' تو انھیں ان سنتوں کی بجا آوری کے لیے کہا جائے گا اور دلائل سے قائل کیا جائے گا۔ ان کے اصرار و انکار پر ان کے خلاف لڑائی کی جائے گی تا آنکہ وہ ان اسلامی شعائر کو اپنا کر اس جماعت میں آملیں جس سے وہ جدا ہو گئے تھے۔

سیاست' تعلیم' نشرواشاعت' حکومت' مال و دولت' صلح و جنگ' غرض زندگی کے ہر مؤثر شعبے کے بارے میں اسلام کے قواعد وضوابط اور احکام و رہنمائی موجود ہے۔ اسلام دنیا جہاں سے کٹ کر یا دوسرے نظریات کا خادم اور ازموں کا تابع بن کر رہنے کے لیے تیار نہیں' بلکہ وہ تو قائد اور سردار بن کے رہنے کے لیے آیا ہے۔ یہاں سیدنا مسیحؑ سے منسوب مقولے پر عمل نہیں ہو سکتا کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خداوند کا ہے وہ خداوند کو دو۔ اسلام کا فلسفہ تو اس بنیاد پر قائم ہے کہ قیصر اور جو کچھ قیصر کا ہے وہ سب خداے واحد کے

لیے ہے۔ زمین وآسمان اور جو کچھ ان میں ہے' سب اللہ کی ملکیت ہے۔ اسلام کے نظریہ توحید کی بنیاد یہ ہے کہ مسلمان' اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب بناتا ہے نہ ولی و حکمران' جیسا کہ توحید کی سب سے بڑی سورہ' سورۃ الانعام بتاتی ہے۔ عقیدۂ توحید فی الحقیقت حریت' مساوات اور اخوتِ انسانی کے حصول کا انقلابی ذریعہ ہے تاکہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر' ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں۔ انسان انسان کی غلامی سے آزاد رہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم' اہل کتاب کے حکمرانوں کے نام خط لکھنے کے بعد' آخر میں یہ آیت کریمہ لکھا کرتے تھے:

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○ (ال عمران ۳:۶۴)

اے نبیؐ' کہو' "اے اہل کتاب' آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں' اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے"۔ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو' ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی واطاعت کرنے والے) ہیں۔

یہ ہے اس بات کا راز کہ مکہ کے سردار اور عرب کے مشرک' روزِ اول ہی سے دعوتِ اسلام کا مقابلہ کرنے کے لیے کیوں اُٹھ کھڑے ہوئے تھے' حالانکہ صرف لاالٰہ الا اللہ کا پرچم بلند کیا گیا تھا۔ اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اس کلمے کے پیچھے کیا ہے؟ اور اس کلمے کو پڑھ لینے سے سماجی اور سیاسی زندگی کے معانی میں کیا تبدیلی آئے گی۔ وہ سب اس سے بخوبی آگاہ تھے کہ اس سے کیا تبدیلیاں اور تغیرات رُونما ہوں گی۔

۲- ایک مسلمان کا غیر سیاسی ہونا' ناممکن ہے۔ الا یہ کہ وہ اسلام کو غلط سمجھے یا اس کی غلط تعبیر کرے۔ ہر مسلمان سیاسی ہوتا ہے' اس لیے کہ اسلام کا عقیدہ' شریعت' عبادات' تربیت مسلمان کی شخصیت پر اثرانداز ہوکر اس کی تعمیر و تشکیل سیاسی نہج پر کردیتا ہے۔ دیکھیے' اسلام مسلمان کے کندھے پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ذمہ داری ڈالتا ہے۔ وہ اس فریضے کو مسلمان حکمرانوں اور عوام کے لیے خیرخواہی کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اسی بات کو حدیث میں مکمل دین کہا گیا ہے۔ قرآن اسے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کہتا ہے۔

ایک مسلمان کو اس کے ایمان کا یہ تقاضا ہمیشہ سیاسی بنائے رکھتا ہے کہ اُسے دوسروں کی مشکلات اور دکھ درد میں شریک ہونا ہے' اس نے صرف اپنے لیے زندہ نہیں رہنا بلکہ اپنے اہل ایمان بھائیوں کے لیے جینا ہے۔ وہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات ۴۹:۱۰) (مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں) پر ایمان رکھتا

ہے۔ حدیث میں ہے: مسلمانوں کے معاملے میں دل چسپی نہیں لیتا وہ ان میں سے نہیں۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسولؐ اور مسلمان حکمرانوں اور عوام کے لیے خیر خواہی نہیں کرتا وہ ان میں سے نہیں۔ جس آبادی (یا محلے) میں ایک شخص بھوکا رہ گیا، اس سے اللہ اور اس کے رسولؐ کا ذمہ اٹھ گیا۔

جس طرح ایک مسلمان سے سماجی ظلم کا مقابلہ کرنے کو کہا گیا ہے اسی طرح اس سے سیاسی ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا بھی مطالبہ کیا گیا ہے۔ ظلم کا خواہ کوئی نام اور کوئی سی نوعیت ہو، اس پر سکوت اور سہل انگاری پوری اُمت کے لیے باعثِ عذاب ہے۔ ظلم کرنے والا اور اس ظلم پر خاموش رہنے والا دونوں یکساں مجرم ہیں۔ ارشادالٰہی ہے: وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ج (انفال ۸:۲۵) ''اور بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انھی لوگوں تک محدود نہ رہے گی جنھوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو''۔ قرآن پاک نے ان قوموں کی مذمت کی ہے جنھوں نے جابروں اور سرکشوں کی اطاعت کی، بلکہ محض ظالموں کی طرف جھکاؤ، میلان اور نفسیاتی رجحان کو بھی عذاب کا موجب قرار دیا ہے۔

> وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ لا وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ○ (ھود ۱۱:۱۱۳) ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا، ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے اور تمھیں کوئی ایسا ولی و سرپرست نہ ملے گا جو خدا سے تمھیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی۔

اسلام ہر مسلمان پر یہ سیاسی ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ ایسی ریاست میں زندگی گزارے جس پر ایک مسلمان امام کتاب اللہ کی رُو سے حکومت کرتا ہو اور عوام نے اس کی بیعت کی ہو۔ اگر کوئی مسلمان ایسا نہیں کرتا تو وہ اہل جاہلیت میں سے ہے۔ صحیح حدیث میں ہے: جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں امام کی بیعت نہیں ہے تو وہ جاہلیت کی موت مرا (مسلم)۔

نماز اور سیاست: مسلمان تو عین حالت نماز میں بھی بحر سیاست میں تیر رہا ہوتا ہے۔ وہ نماز میں اُن آیات کی تلاوت کرتا ہے جن میں اُن امور کا بیان ہے جسے لوگ ''سیاسی'' کہتے ہیں۔ اسی طرح خاص طور پر جہری نماز میں قنوت نازلہ (وہ دعا جو آخری رکعت میں، رکوع سے اٹھنے کے بعد کی جاتی ہے) پڑھنے سے زیادہ سیاسی بات کیا ہو سکتی ہے۔ یہ دعا دشمن سے مقابلے، زلزلے، سیلاب یا قحط جیسے مواقع پر مانگی جاتی ہے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ امام شہید حسن البناؒ نے اس شرعی حکم (قنوت نازلہ) پر مصری قوم کو، انگریزوں کے خلاف کیسے آمادہ کیا؟ آپ نے روزنامہ اخبار الاخوان المسلمون میں ایک مضمون لکھا جس میں مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ قابض انگریزوں کے خلاف اپنی نمازوں میں قنوتِ نازلہ پڑھا کریں۔ آپ نے ایک دعا

بھی لکھی تھی اور کہا تھا کہ اسی طرح کی دعا کیا کریں، تاہم آپ نے لوگوں کو ہو بہو یہی دعا کرنے پر اصرار نہیں کیا تھا۔ ہم لوگوں نے امام البنّاؒ کی بتائی ہوئی دعا زبانی یاد کر لی تھی جو ہم نمازوں میں پڑھا کرتے تھے۔ اس دعا کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

> یااللہ! جہانوں کے پروردگار! خوف زدہ لوگوں کی امان، متکبروں کو ذلیل کرنے والے، جابروں کی گردن توڑنے والے، اے اللہ تو جانتا ہے کہ ان ظالم و غاصب انگریزوں نے ہماری زمین پر قبضہ کرلیا ہے۔ ہمارا حق چھینا ہے، ملک میں سرکشی کی ہے، اور اس میں بہت فساد مچا رکھا ہے۔ اے اللہ! ان لوگوں کے مکروسازش سے ہمیں محفوظ رکھ، ان کی دھار کند کر، ہمارے ملک سے ان کا اقتدار ختم کر۔ ان کی سلطنت کو زوال دے، یااللہ اپنے مومن بندوں میں سے کسی پر ان کا بس نہ چلنے دے۔ یااللہ! ان کو پکڑ، ان کے مددگاروں کو پکڑ، ان کے حامیوں اور ان سے محبت و دوستی رکھنے والوں کو پکڑ۔ ایسے پکڑ جیسے ایک بااختیار صاحبِ اقتدار پکڑتا ہے۔

دیکھیے کہ ہم عین محرابِ مسجد میں، نماز کے دوران میں، جب پورے خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کر رہے ہوتے تھے، تو سیاست کے میدان میں بھی دخل دے رہے ہوتے تھے۔ یہ ہے اسلام کا مزاج کہ اس میں دین، دنیا سے الگ نہیں ہوتا اور نہ دنیا دین سے جدا ہوتی ہے۔ قرآن وسنت اور تاریخ کسی ایسے دین سے ناآشنا ہیں جو مملکت کے بغیر ہو یا ایسی مملکت سے جو دین کے بغیر ہو۔

دین و سیاست کی جدائی کے دعویٰ: کچھ لوگوں کا خیال بلکہ زعمِ باطل ہے کہ دین کا سیاست سے کچھ تعلق نہیں۔ ان لوگوں نے یہ جھوٹ تراشا ہے کہ ''سیاست میں کوئی دین نہیں اور دین میں کوئی سیاست نہیں''۔ کمال یہ ہے کہ خود ان لوگوں نے ''دین'' کو اپنی ''سیاست'' کے لیے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا ہے تاکہ اپنے مذموم وادنیٰ مقاصد کی برآری کرسکیں۔ یہ لوگ علم دین کے لحاظ سے بعض کمزور حضرات کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ اپنی باطل سیاست اور دنیوی لحاظ سے اپنی بے کار پالیسیوں کے حق میں دینی نقطۂ نظر سے من پسند فتویٰ لے سکیں۔

مجھے اب تک یاد ہے کہ جب ہم ۴۹/۱۹۴۸ء میں جیل خانہ طور میں تھے تو ہم پر جو---قرآن کی حکمرانی اور اس نظام کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے تھے--- یہ فتویٰ جاری کیا گیا کہ:

> یہ لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کے خلاف جنگ کر رہے ہیں، زمین میں فساد پھیلا رہے ہیں، لہٰذا انھیں بھیانک طور پر قتل کر دیا جائے یا صلیب پر لٹکایا جائے یا مخالف سمت سے ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹ دیے جائیں یا یہ کہ انھیں ملک بدر کر دیا جائے۔

حق پرستوں کے خلاف یہ کوئی نئی بات نہیں۔ تاریخ میں ایسا کئی بار ہوا ہے۔ اسٹیج اور کردار بدلتے رہے ہیں' ذہنیت وروش یہی رہی ہے۔ مجھے ابھی تک یاد ہے اور عوام کو بھی یاد ہوگا کہ کیسے مفتیوں سے کہا گیا کہ وہ صہیونی ریاست کے ساتھ صلح کے جائز ومشروع ہونے کا فتویٰ صادر کریں' تاکہ ان کی شکست خوردہ پالیسی کی تائید ہو سکے۔ حالانکہ اس سے پہلے اسرائیل کے ساتھ صلح کے حرام ہونے کا فتویٰ جاری ہو چکا تھا اور اسرائیل کے ساتھ صلح کو اللہ' اس کے رسولؐ اور مومنوں کے ساتھ خیانت قرار دیا گیا تھا۔

اپنی مذموم سیاسی اغراض کے لیے حکام علما کی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ اُن سے بنک کے سود کے حلال ہونے اور اسی قسم کے دیگر مقاصد کے لیے فتاویٰ لے سکیں۔ انھیں بعض ضعیف الایمان اور قلیل العلم لوگ مل ہی جایا کرتے ہیں مگر راسخ العقیدہ علماے کرام ایسے فتاویٰ دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔

اَلَّذِیْنَ یُبَلِّغُوْنَ رِسٰلٰتِ اللّٰہِ وَیَخْشَوْنَہٗ وَلَا یَخْشَوْنَ اَحَدًا اِلَّا اللّٰہَ ط (الاحزاب ۳۳:۳۹) جو اللہ کے پیغامات پہنچاتے ہیں اور اُسی سے ڈرتے ہیں اور ایک خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

علامہ ابن قیمؒ نے امام ابوالوفاؒ ابن عقیل حنبلی سے نقل کیا ہے: ''سیاست ایسا عمل ہے جس کی وجہ سے لوگ صلاح وخیر کے زیادہ قریب اور فساد سے بہت دُور ہو جاتے ہیں' جب تک کہ سیاست' شریعت کے خلاف نہ ہو''۔ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: ''عادلانہ سیاست' شریعت کی تعلیمات وہدایات کی مخالف نہیں ہوتی' بلکہ اس کے موافق ہوتی ہے' بلکہ سیاست تو شریعت کے اجزا میں سے ایک جز ہے۔ ہم اسے ''سیاست'' آپ حضرات کی اصطلاح کے تحت کہتے ہیں ورنہ یہ تو اللہ اور اس کے رسولؐ کا عدل ہے۔ (الطرق الحکمیة فی السیاسته الشرعیة لابن القیم' ص ۱۳-۱۵' مطبوعہ السنة المحمدیة)

ہمارے علما سلف نے سیاست کی قدر وقیمت اور اس کی فضیلت بیان کی ہے حتیٰ کہ امام غزالی علیہ الرحمۃ نے فرمایا ہے: ''دنیا آخرت کی کھیتی ہے اور دین دنیا کے بغیر مکمل نہیں ہوتا' اقتدار اور دین جڑواں ہیں۔ دین اصل ہے اور اقتدار محافظ وپہرے دار ہے۔ جس کی اصل وبنیاد نہ ہو وہ گر جاتا ہے اور جس کا محافظ نہ ہو وہ ضائع ہو جاتا ہے''۔ (احیاء علوم الدین '۱/۱۷' باب العلم الذی ھو فرض کفایة' مطبوعہ دار المعرفة' بیروت)

''امامت'' یا ''خلافت'' کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ ''یہ دین کی نگہبانی اور اس کے ذریعے دنیا کی سیاست میں صاحب شرع حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابتِ عامّہ ہے''۔ (النظریات السیاسیة الاسلامیة' ڈاکٹر ضیاالدین الریس' ص ۱۲۵' طبع ششم)

پس معلوم ہوا کہ خلافت نگہبانی اور سیاست ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبلغ' معلم اور قاضی

ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست کار بھی تھے۔ آپؐ کے ہدایت یافتہ خلفا بھی سیاست کار تھے‘ اس لیے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نہج وطریق پر چل رہے تھے۔ ان حضرات نے عدل واحسان کے ساتھ اُمت کو درست راستے پر چلا کر سیاست فرمائی اور علم وایمان کے ساتھ اُمت کی قیادت کی۔

سیاست کی اس مسلمہ اہمیت کے باوجود ہمارے دور کے لوگ ''سیاست'' اور ''سیاست دانوں'' سے نفرت کرنے لگے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ سیاست پر میکاولی فکر کی گہری چھاپ‘ استعمار اور خیانت کار حکمرانوں‘ ظالموں اور آمروں کی سیاست ہے۔ شیخ محمد عبدہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے سیاست کاروں کے مکر وفریب سے تنگ آکر اپنا یہ مشہور قول کہا تھا: اعوذ باللّٰہ من السیاسته ومن ساس وسیوس وسائس ومسوس (میں سیاست‘ سیاست کرنے والوں اور جن پر سیاست کی جائے‘ سب سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں)۔ فکر اسلامی کے مخالفین نے عوام کی سیاست دانوں سے اس نفرت کا فائدہ اٹھایا اور اس جامع وکامل نظامِ اسلام کے بارے میں جس کی طرف حامیانِ اسلام دعوت دیتے ہیں‘ کہنے لگے کہ یہ ''سیاسی اسلام'' ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب ہر مسلمان کو جو نفاذِ اسلام کے لیے کوشاں ہو‘ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ ''سیاست دان'' بنا ہوا ہے اور ''سیاست میں حصہ لیتا ہے''۔ اس چیز کو ان کی مذمت اور ان سے نفرت دلانے کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

کچھ بعید نہیں کہ ایسا وقت بھی آئے جب مسجد میں نمازِ باجماعت ادا کرنے کو ''سیاسی نماز'' کہہ دیا جائے۔ سیرت ابن ہشام‘ جیسی کتاب سے غزوات کے مطالعہ یا بخاری میں غزوات کے مطالعہ کرنے کو ''سیاسی مطالعہ'' قرار دیا جائے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خود قرآن کریم کی تلاوت اور اس کی کسی مخصوص سورہ کو ''سیاسی تلاوت'' کہہ دیا جائے۔ ہم ابھی تک اس دور کو نہیں بھولے جب ''ملزموں'' کے خلاف لگائے گئے ''الزامات'' کی فہرست میں یہ ''الزام'' بھی شامل ہوتا تھا کہ انھوں نے سورۃ الانفال حفظ کی ہے جو کہ جہاد کی سورہ ہے اور جہاد پر آمادہ کرتی ہے۔

مغرب اور اسلام میں مکالمہ: بنیادی سوالات

پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد ○

اسلام اور مغرب کے درمیان علمی و عملی طور پر ایک مکالمے بلکہ تعامل کا آغاز عہد نبویؐ میں اسی وقت ہوگیا تھا' جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرق و مغرب کے فرماں رواؤں کو کھلے دل اور کشادہ بانہوں کے ساتھ اسلام کے عالمگیر پیغام پر غور کرنے کی دعوت دی تھی' اور اہل روما کو ان کی اپنی خود ساختہ اور خود عائد کردہ مذہبی تنگ نظری' غلو اور آبا پرستی سے نکلنے کی راہ دکھائی تھی۔ اسلام کی یہ پکار ایک نئی فکر' نئے طرزِعمل اور نئی دنیا تعمیر کرنے کی دعوت تھی۔

اس دعوت میں سلمانؓ ایک عجمی کی شکل میں' صہیبؓ ایک مغربی نمایندے کی صورت میں' بلالؓ ایک افریقی النسل باشندے کے طور پر اور ابوبکرؓ و ابوذرؓ، ان تمام طبقات سے وابستہ افراد کے طور پر شامل ہوئے' جو کبھی نسب اور مال و دولت کو' کبھی منصب کو خدا کا مقام دیتے تھے۔ لیکن اسلام کی انقلابی تحریک سے وابستگی نے ان کی وہ ماہیت قلبی کی کہ عجمی عجمی نہ رہا' عربی کا فخر و کبر اور امتیاز اور صاحب مال کا تفاخر و تکاثر' سب کچھ ایک نئے قالب' نئی شکل اور نئے زاویۂ نظر میں تبدیل ہوگیا۔ اب معیار صرف ایک رہا' وہ یہ کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط (الحجرات ۴۹:۱۳) ''اللہ کے نزدیک صرف تقویٰ والا ہی باعث اکرام ہے''۔

اسلام ایک انقلابی تحریک' ایک دعوت فکر و عمل اور ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت سے انسانیت کا نجات دہندہ بن کر ابھرا' اور مشرق کا سرا مغرب سے یہ کہہ کر ملا دیا کہ: مشرق و مغرب صرف اور صرف اللہ ہی کے لیے ہیں۔ وہی مشرق و مغرب کا خالق و مالک ہے۔ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ فَاتَّخِذْہُ وَکِیْلًا ○ (المزمل ۷۳:۹) ''وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے' اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے' لہٰذا اسی کو اپنا وکیل بنالو''۔

○ مدیر اعلیٰ سہ ماہی مغرب اور اسلام' اسلام آباد

اس لیے انسان کا مرجع اور مرکز عبودیت... نہ مشرق ہے اور نہ مغرب' نہ کوئی مغرب کا بندہ ہے اور نہ کوئی مشرق کی بندی ہے' نہ بیٹی' بلکہ مغرب و مشرق اپنے وجود کے لیے اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم اور ربوبیت کے محتاج و تابع فرمان ہیں۔ مشرق ہو یا مغرب' اپنے رب سے بغاوت و سرکشی اسے کبھی کامیابی سے ہم کنار نہیں کر سکتی۔ فوز و فلاح' سربلندی و نجات' سربراہی و قیادت' نصرت و فتح' صرف اسی کو حاصل ہوگی' جو شعوری طور پر اور عملی طور پر' اولاد آدم علیہ السلام کے مقصد تخلیق و مقصد حیات کو پا گیا اور حقوق الٰہی اور حقوق العباد کی صحیح طور پر ادائیگی کے لیے مجاہدین کی صف میں شامل ہو گیا۔

مغرب کے خردمند یہ سوال اٹھاتے ہیں:

- اگر اسلام اتنا جامع' شامل' کامل اور ہمہ گیر نظام ہے' تو پھر اسلام اور مغرب میں یہ دوئی' تضاد' جدال و کش مکش کیوں ہے؟
- اگر اسلام صلح کل' عدل اجتماعی' احترام انسانیت' حیات آفریں' تحفظ' عقل' نسل' دین اور متوازن ملکیت کا علم بردار ہے' تو پھر مسلمانوں میں ملوکیت' اقتدار کی رسہ کشی' مادیت' استحصال اور فتنہ و فساد کا وجود کیوں ہے؟

یہ اور ایسے بہت سے سوال اپنی اہمیت اور معنویت کے لحاظ سے غیر معمولی طور پر قابل توجہ ہیں۔ ان کی وضاحت بلا کسی معذرت کے علمی و عملی سطح پر کی جا سکتی ہے' کی جاتی رہی ہے اور ان شاء اللہ کی جاتی رہے گی۔ اس وقت ہمارے پیش نظر معروضی طور پر صرف یہ دیکھنا ہے کہ مغرب: اسلام اور اسلام کے ماننے والوں کو کس رنگ میں دیکھتا ہے۔ اس کی عینک رنگین ہے یا شفاف۔ اس کی فکر اور علمی تجزیہ کس حد تک مبنی بر حقائق ہے اور کس حد تک اس نے اپنے نقطۂ نظر کو ثبوت فراہم کرنے کے لیے سخن سازی سے کام لیا ہے۔

مغرب اور اسلام کے حوالے سے عموماً ہمارا مشاہدہ ہے:

- اہل قلم کا ایک طبقہ ایسا ہے' جو مغربی تعلیم یا مغرب زدگی کے نتیجے میں غیر شعوری طور پر اسلام کو مغرب کی نگاہ سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ اسے اسلام کی بہت سی تعلیمات میں ''نقائص'' اور حالات حاضرہ سے عدم مطابقت نظر آنی شروع ہو جاتی ہے۔ ایسے اہل قلم اکثر بڑے نپے تلے انداز میں بین السطور اور بعض اوقات تجاہل عارفانہ سے اپنے خدشات کا اظہار کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ معروضیت (objectivity) پر عمل پیرا ہیں۔
- دوسرا طبقہ اس کے بالکل برخلاف مغرب کی ہر نام نہاد اچھائی کو کسی نہ کسی طرح اسلام میں ڈھونڈ نکالتا ہے' اور اپنی تحقیق کو ثابت کرنے کے لیے معذرت پسندانہ رویہ اختیار کرتا ہے۔ جس میں غالباً

نیک نیتی کے ساتھ ایک بنیادی محرک اسلام کو مغرب کے لیے قابلِ قبول بنانا ہوتا ہے۔

- تیسرا طبقہ اہل قلم مغرب کو اپنا ازلی و ابدی دشمن تصور کرتے ہوئے آنکھیں بند کر کے مغرب کی ہر چیز کو تحقیر اور نفرت آمیز نگاہ کے ساتھ دیکھتا' اور مغربی فکر و عمل کو مجموعی طور پر رد کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

معروضیت ان تینوں طرز ہائے عمل سے مختلف ایک ایسا علمی طرزِ عمل ہے جس میں حقائق جیسے ہیں' بزبانِ حال اپنا موقف اور رائے کو ظاہر کریں اور ایک قاری اور محقق ان حقائق کے مطالعے کے بعد آزادانہ طور پر انھیں قبول یا رد کر سکے اور ان کی تعبیر مثبت یا منفی طور پر کر سکے۔ اسی بنا پر معروضیت کا دعویٰ کرنا اور معروضیت اختیار کرنا دو بالکل مختلف اعمال ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ معروضی طرز تحقیق کا آغاز: ''حقائق کو' جیسے کہ وہ ہیں' بغیر کسی قبل از وقت تعصب و تفریق کے مشاہدہ'' کرنے سے ہوتا ہے۔ اس لیے حقائق کا تجزیہ' محرکات و اسباب کا تعین' نتائج و عواقب کا اندازہ' تحقیق کے عمل کے لازمی عناصر ہیں۔ لیکن یہ علمی درجات اسی وقت صحیح سمت میں لے جاسکتے ہیں' جب نقطۂ آغاز پر حقائق کو بلا کسی تعصب کے مشاہدے میں لے آیا جائے۔

جس طرح اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں کسی تحریر میں پہلے سے طے شدہ تصورات' تعصبات اور تفریق اور ذہنی تردد اور تحفظات' عدم معروضیت کی نشان دہی کرتے ہیں' بالکل اسی طرح بہت سے مسلمان اہل قلم کا مغرب کی ہر بات کو شک و شبہے اور سازشی نفسیات کی روشنی میں دیکھنا کسی معروضی ذہن کا پتا نہیں دیتا۔

ان تمام امکانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ امر واقعہ ہے کہ اسلام انسانی نفسیات' شعور و آگہی اور ذہن کی محدودیت اور وسعت فکر کو تسلیم کرتے ہوئے شہادت حق کی تعلیم اور کتمان حق کی ممانعت کرتا ہے۔ اس بنا پر ایک ایسا فرد جو فی الحقیقت اسلام کے آفاقی اصول شہادت' تزکیہ شہود اور احتساب نفس کے مطالبات سے آگاہ ہو' وہی اپنوں اور اغیار دونوں کے ساتھ انصاف اور معروضیت سے معاملہ کر سکتا ہے۔ ہماری نگاہ میں مغرب سے بلادلیل اور بلا حجت معاندانہ رویہ رکھنا ایسا ہی غیر مطلوب عمل ہے' جیسا اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مغرب کا محض توہمات اور قیاسات کی بنا پر ایک منفی رائے قائم کرنا۔

یہ بات کسی تعارف کی محتاج نہیں کہ کفر و ظلم' طاغوت' فتنہ و فساد کا رد بر بنائے دلیل و برہان کرنا اسلام کا مدعا و مقصود ہے: يَآَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ○ (النساء ۴:۱۷۴)۔ ''لوگو' تمھارے ربّ کی طرف سے تمھارے پاس دلیلِ روشن آگئی ہے اور ہم نے تمھاری طرف ایسی روشنی بھیج دی ہے' جو تمھیں صاف صاف راستہ دکھانے والی ہے'' ___ اسلام جس اصول

پر اپنے ماننے والوں کو عمل کا حکم دیتا ہے' عدل کی بنا پر اسی اصول پر عمل کرنے کے لیے تمام انسانوں کو دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ کُل نوعِ انسانی کو مخاطب کرتے ہوئے کہتا ہے: قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ (البقرہ ۲:۱۱۱) ''ان سے کہو' اپنی دلیل پیش کرو' اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو''۔

ہم اپنے آپ کو نہ مشرق کا اجارہ دار سمجھتے ہیں اور نہ مشرق کے دفاع کا ذمہ دار۔ ہمارے نزدیک حق' مشرق و مغرب کی قید سے بلند تر قدر (value) کا نام ہے۔ حق جس کا تعین قرآن و سنت نے کر دیا ہے' خواہ مغرب کی طرف ہو یا مشرق کی طرف' قرآن عظیم کا حکم ہے کہ اسے بلا تکلف اور بلا تردد اختیار کیا جائے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ز وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا قف هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ز وَاتَّقُوا اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○ (المائدہ ۵:۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو' یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو' جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

دین اسلام' توحید اور عدل سے عبارت ہے۔ یہ دین چاہتا ہے کہ مخالف کے ساتھ بھی ذرہ برابر ناانصافی نہ ہو۔ اسے اپنی بات' اپنی زبان میں پوری وضاحت سے کہنے کا موقع دیا جائے۔ پھر تجزیہ و تحلیل کے ذریعے اور دلیل و برہان کی بنا پر اس کی بات کو قبول یا رد کیا جائے۔

ہرچند کہ مغرب نے بڑی حد تک اپنے اوپر اسلام کا ہَوا بلکہ ڈراوا مسلط کر رکھا ہے اور اہل اسلام کو اپنی خیالی دنیا کے اس خانے میں رکھ دیا ہے جہاں پر بُعد' عدم تعلق' عداوت' تضاد' جدل اور تصادم کے جذبات غالب نظر آتے ہیں۔ اس کے برخلاف اسلام' تحریک دعوت و اصلاح ہونے کے سبب ایک ایسے فرد کو بھی' جو اسلام سے دُور رہنا چاہتا ہو' دُور کرنا نہیں چاہتا' بلکہ اس کی فکری' نظری اصلاح کے ذریعے' معلومات کی ترسیل و تبلیغ کے ذریعے اس تک حق کو جیسا کہ وہ ہے' پہنچانا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اسلام کی نگاہ تعصب اور پہلے سے طے کردہ تصورات سے خالی ہونے کے سبب ہر مشرک' کافر' مخالف اور بظاہر دشمن کو بنیادی طور پر ایک اچھا انسان مانتے ہوئے اسے امکانی (potential) مسلمان قرار دیتی ہے اور کھلے ذہن کے ساتھ اسے اسلام کے اصولوں سے واقف کرانے کو اپنا فرض سمجھتی ہے۔

ایک اصلاحی تحریک اور ایک متحارب تحریک میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ایک اصلاحی تحریک ایک ہمدرد

طبیب کی طرح ایک مرض کی علامات کو دیکھنے اور مرض کی تحقیق کرنے کے بعد اس کی صحت کی اصلاح کی کوشش کرتی ہے' مرض کی جڑ اور بنیاد کو دُور کرتی ہے اور مریض کی قوت مدافعت کو مضبوط کر کے مرض پر غالب آنے کے قابل بناتی ہے۔ اسلام مریض کا نہیں مرض کا دشمن ہے اور چاہتا ہے کہ ظلم' ناانصافی' جھوٹ' بے وفائی جہاں کہیں بھی اور جس میں بھی ہو اس کی اصلاح ہو اور ان منفی خصوصیات کی جگہ حق' عدل' صدق اور وفاداری انسان کی شخصیت اور معاشرے کی شخصیت کا بنیادی جزو بن جائے۔ اس کی یہ مخالفت نہ کسی نسل کی بنا پر ہے نہ رنگ نہ زبان نہ شمال یا جنوب یا مشرق یا مغرب سے وابستگی کی بنا پر' جب کہ مغرب خود کو ایک نسلی' جغرافیائی اتحاد سمجھتے ہوئے دوسروں کو اور ان کی اقدار کو دشمن گردانتا ہے۔ اس کے باوجود اسلام اور مغرب کو من حیث المجموع دو ابدی اور ازلی دشمن سمجھ لینا شاید اسلام اور مغرب دونوں کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اسلام نہ مشرق کا پیدا کردہ ہے' اور نہ مشرق یا مغرب میں کسی پر اجارہ داری کا دعویٰ کرتا ہے۔ اسلام تو یہ چاہتا ہے کہ کفر' ظلم' فتنہ وفساد اور بغاوت خواہ مغرب میں ہو یا مشرق میں' اس مرض کو دور کیا جائے اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ہدایت کو مشرق ہو یا مغرب' وہاں مکمل طور پر رائج' نافذ' قائم اور مستحکم کیا جائے۔

معروضیت کا دعوے دار مغرب کس طرح اسلام اور مسلمانوں کو دیکھتا ہے اور مخاطب کر رہا ہے؟ اسے سمجھنے کے بعد ہی ہم یہ طے کر سکتے ہیں کہ اسلام کی اصلاحی تحریک کس طرح اس فساد' عدم توازن اور غلو کے طرزِ عمل کو جو مغرب نے اسلام سے ناواقفیت یا اپنے غلط تصورات کی بنا پر اختیار کر لیا ہے' اصلاح کے عمل کے ذریعے راست روی کی طرف لائے۔

ہم اسلام کی صداقت وحقانیت اور کمال عملیت پر مکمل ایمان اور یقین رکھتے ہوئے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ مغرب اور مشرق میں' اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے جو اہم اور مرکزی رجحانات پائے جاتے ہیں' انھیں سمجھا جائے۔ اہداف کا تعین کرنے کے بعد ان فکری غلطیوں کی اصلاح کی جائے' جو اسلام اور مسلمانوں اور اسلام کے نام نہاد نقادوں اور ''اصلاح پسندوں'' کے درمیان ایک دبیز پردے بلکہ ایک معاندانہ رویے کا سبب بن گئی ہیں۔

مغرب کی جانب سے' اسلام اور مسلمانوں کو دہشت گردی' تشدد' خوں ریزی اور قتل وغارت کے ساتھ وابستہ کرنا بظاہر کوئی نیا مشغلہ نہیں ہے۔ صلیبی جنگوں کا تذکرہ ہو یا جہاد کے حوالے سے اصلاحی تحریکات کو توسیع پسندانہ خوں ریزی قرار دینا ہو' مغرب صدیوں سے اسلام اور مسلمانوں کو ''غیر امن پسند'' اور ''فسادی'' ہی قرار دیتا رہا ہے۔ اس نوعیت کا تجزیہ کرتے وقت عام طور سے مغربی محقق: صہیونی ظلم وستم' بوسنیا ہرزے گووینا میں انسانیت سوز حرکات' چیچنیا میں مسلمانوں پر بدترین مظالم' اور خود مسلکی اختلافات کی

بنا پر شمالی آئرش ریاست میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کی شرم ناک خوں ریزیوں کو تجاہل عارفانہ سے نظرانداز کر جاتے ہیں' اور اگر کہیں بوے خوں محسوس کرتے ہیں' تو وہ انھیں مسلمانوں کے بارے میں وضع کردہ فسانوں ہی میں ملتی ہے۔

کیا جہاد' دہشت گردی کی تعریف میں آتا ہے؟ کیا مسلم حریت پسند تحریکات' بغاوت کی تعریف میں آتی ہیں؟ کیا انسانی حقوق' جان' عزت و ناموس کا تحفظ کرنا جارحیت ہے؟ اور کیا آنکھیں بند کر کے ان بے سہارا مستضعفین فی الارض مظلوموں پر پل پڑنا ہی معروضیت ہے؟ ہمارے خیال میں اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے مبالغے اور تواتر سے بعض الزامات کو اتنا دہرایا گیا ہے کہ بہت سے مسلمان خود بھی اس تکرارِ کذب کی سازش کا شکار ہو گئے ہیں۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے جہاد اور تحریکات جہاد ایسی اصلاحی تحریکات ہیں' جن کا عدم وجود معاشرے میں ظلم' طاغوت اور فتنہ وفساد کو کھلا چھوڑ دیتا ہے۔ اس لیے عدل کے قیام کے لیے جہاد کا اس کی صحیح روح کے ساتھ باقی و جاری رہنا انسانیت کی حیات اور وجود کے لیے ضروری ہے۔ جہاد محض ایک دفاعی طرزِ عمل کا نام نہیں ہے' بلکہ جہاد ایک اصلاحی عمل ہے جو امن اور قوت کے استعمال کے اخلاقی طریقوں کو یکجا کر دیتا ہے' اور عقلی ترجیحات کی بنا پر یہ فیصلہ کرنا سکھاتا ہے کہ قوت کا استعمال کیا جائے یا نہیں' اور اگر کیا جائے تو کون سے مرحلے میں اور کس طرح اور کس حد تک!

مغرب کے وضعی خدشات اور اسلامی تحریکات

اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے جو فکری پریشانیاں مغرب کو درپیش ہیں' غالباً ان میں سرفہرست ایک "مذہبی ریاست" (theocracy) کے قیام کا امکان ہے۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں' چاہے وہ الجزائر ہو یا ایران' چیچنیا ہو یا ترکی' بوسنیا ہرزے گووینا ہو یا اسلامی جمہوریہ پاکستان' اسلام کی بنیاد پر کسی سیاسی تبدیلی کی شروعات ہی مغربی مفکرین اور ارباب سیاست کو مذہب پر مبنی سیاسی اقتدار کے تصور سے متفکر بلکہ متوحش کر دیتی ہیں۔ اس فکر اور پریشانی کا تعلق محض ان مفکرین کے ساتھ نہیں ہے جو بعض مغربی ممالک میں ارباب سیاست کے مشیروں کی حیثیت رکھتے ہیں' بلکہ ایسے تحقیق کار بھی اس فہرست میں شامل ہیں' جنھیں بالعموم اسلام دوست یا کم از کم غیر جانب دار کہا جاتا ہے' مثلاً: ہملٹن گب اپنی کتاب Modern Trends in Islam, 1947 میں' پروفیسر ولفرڈ کینٹ ول اسمتھ Islam in Modern History, 1957ء میں' یا ڈاکٹر جان اسپوزیٹو Islam and Politics, 1991ء میں' بظاہر اپنی مسلم دوستی اور ہمدردانہ طرزِ عمل کے علی الرغم دور جدید کی اسلامی احیائی تحریکوں اور

اسلامی ریاست کے قیام کی کوششوں کا تجزیہ انھی خدشات کے سیاق و سباق میں کرتے ہیں۔

مغرب کے ان خدشات اور ان سے منسوب کردہ مذہبی جنونیت اور ''بنیاد پرستی'' کے خوف کو ایک محدود اور اقلیتی فکر قرار دے کر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر مغربی ذہن میں ان خدشات کا وجود پایا جاتا ہے تو مسلمان اہل علم کو معروضی طور پر یہ کوشش کرنا ہوگی کہ ان خدشات کو محض تعصب کا ابال کہہ کر نہ ٹال دیں، بلکہ ان کے تاریخی، نفسیاتی، سیاسی، معاشی، ثقافتی اور بین الاقوامی پہلوؤں پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی کوشش کریں۔

اسلام اور ''مذہبی ریاست'' کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے مسلم دوستی رکھنے والے مغربی محققین ہی نہیں خود مسلم دانش وروں کی ایک جماعت یہ سمجھتی ہے کہ مغربی جمہوریت دراصل اسلامی تعلیمات سے ہی اخذ کردہ ہے۔ ان کے خیال میں اسلامی ریاست دراصل ایک جدید رفاہی ریاست ہی ہے، جو اسلام کو حد سے حد ریاستی مذہب قرار دیتی ہے۔ چنانچہ مغربی جمہوریت اور اس میں پائے جانے والے بنیادی ادارے مثلاً سوشل سیکورٹی سسٹم، بشمول معمر افراد کے لیے خصوصی مکانات، ملازمت سے وابستہ خواتین کے لیے اقامت گاہوں وغیرہ، کے ساتھ اگر مذہب کے لیے مناسب جگہ پیدا کر دی جائے تو ایک اسلامی جمہوری اور فلاحی ریاست جو جدید دور کے لیے قابل قبول ہو وجود میں آسکتی ہے اور اس طرح قدامت پرستی کے الزام سے نجات بھی مل سکتی ہے۔

ایک دوسرا طبقہ، جو مذہبی ریاست سے یہ مفہوم لیتا ہے کہ مذہبی جماعتوں کے نمایندے حکومت کی ذمہ داریوں پر فائز ہو جائیں، یہ سمجھتا ہے کہ اسلامی شریعت کی علاماتی تعزیرات اور حدود کو نافذ کر دیا جائے تو گویا مذہبی ریاست کا قیام عمل میں آجائے گا۔ چنانچہ ان کے خیال میں تعزیری قوانین کو اگر کسی آرڈیننس کے ذریعے قانون کا حصہ بنا دیا جائے تو معاشرہ جرم اور ظلم سے پاک ہو جائے گا۔ گویا معاشرے کے جھاڑ جھنکار کو محض شاخوں کی تراش خراش سے، خرابی کی جڑ کو ہاتھ لگائے بغیر ہی دُور کیا جاسکتا ہے۔

مغربی اور مغرب زدہ مسلم مفکرین، یورپ میں کلیسا (چرچ) کے دور اقتدار میں ہونے والے ظلم و ستم کی تاریخ کو ذہن میں رکھتے ہوئے یہ تصور کرتے ہیں، کہ اگر قرون وسطیٰ کے عیسائی ذہن سے ملتا ہوا کوئی مذہبی طبقہ برسراقتدار آگیا تو لازماً ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مذہبی جبر و تشدد کا بازار گرم کر دے گا۔ اس کی ترجیحات کچھ یوں ہوں گی:

- اولاً، قرون وسطیٰ کی عیسائی کلیسا کی روایت کو تازہ کرتے ہوئے خردمندی اور دانش کی بساط کو لپیٹ کر رکھ دیا جائے گا، اور کلیسائی اجارہ داری کے طرز پر اندھے عقیدے، تقلیدِ محض اور روایت پرستی کو

رائج کیا جائے گا۔

- ثانیاً' یورپ کی نشات ثانیہ سے قبل کے روحانی پیشوا اپنے ''الٰہی'' اختیار کو سیاست پر قابض ہو کر اندھادھند استعمال کریں گے اور ان کے کسی فتوے کے خلاف آواز نہ اٹھائی جا سکے گی۔
- ثالثاً' یہ متشدد بلکہ مذہبی جنونی لوگ' مذہب کے نام پر عدل و انصاف' انسانی حقوق' حریت اور جمہوری اقدار کو پامال کرتے ہوئے ایک سفاک اور جابر سیاسی نظام کو قائم کر دیں گے۔ نتیجتاً دنیا سے رواداری' امن' مذہبی آزادی' حقوق نسواں' ترقی اور علمی سرگرمی کا جنازہ اٹھ جائے گا۔

مغربی مفکرین اور ارباب سیاست ہی نہیں ان سے متاثر نام نہاد لبرل اور ترقی پسند اسلام کے علم بردار بھی دورتاریکی میں یورپی عیسائیت کے تجربے سے اخذ کردہ مندرجہ بالا فکری وحشت کو اپنے نظری شکوک و ابہام کی شکل میں مسلسل پیش کرتے رہے ہیں۔ وہ اسلامی ریاست کو تجاہل عارفانہ یا بدنیتی سے ''تھیاکریسی'' قرار دیتے ہیں جو ایک علمی بددیانتی ہے۔

اسلامی ریاست کسی مذہبی طبقے یا گروہ کے بالجبر صاحب اختیار بن جانے کا نام نہیں ہے۔ یہ ان اصولوں پر مبنی سیاسی نظام کے قیام کا نام ہے' جو قرآن وسنت کی تعلیمات اور خلافت راشدہؓ سے استنباط کیے گئے ہیں۔ ان میں اولین اصول حاکمیت الٰہی' یعنی انسانی عقل اور قانون پر وحی الٰہی کی فوقیت کا بنیادی اصول ہے' شریعت (قرآن وسنت) کی بالادستی نہ کہ کسی مذہبی طبقے کی ''معصومیت'' اور برتری ہی اسلامی ریاست کو ایک تھیاکریسی کے تصور سے آزاد کر دیتی ہے۔

اسلامی ریاست میں فوقیت کسی مسلکی یا مذہبی طبقے یا اس کے نمایندے کے حکم کی نہیں' بلکہ براہ راست کتاب وسنت کی ہے۔ اولی الامر' صاحب اختیار و اقتدار فرد محض ایک نافذ کرنے والا کارندہ ہے' اور صرف اس وقت تک صاحب اختیار ہے جب تک قرآن وسنت کو نافذ کرتا ہے۔ قرآن کریم وہ واحد آسمانی کتاب ہے جو اولی الامر (authorities) کو صرف اس وقت تک صاحب اختیار (authority) مانتی ہے جب تک وہ قرآن وسنت کے احکام کو نافذ کریں۔ اگر وہ خود آمر بن بیٹھیں اور قرآن وسنت سے انحراف کریں تو ان کی اطاعت معصیت بن جاتی ہے۔ قرآن کریم نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ ج (النساء ۴:۵۹) ''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسولؐ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں''۔ حدیث نبوی نے یہ اصول واضح کر دیا کہ لاطاعة المخلوق فی معصیة الخالق (اللہ خالق حقیقی کی خلاف ورزی کی شکل میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہوگی)۔ اسی طرح اسلامی ریاست دراصل ایک شورائی ریاست ہے جس میں تمام معاملات

باہمی صلاح ومشورے سے طے ہوتے ہیں۔ اس میں بادشاہت‘ آمریت یا کسی پیشہ ور حزبِ اختلاف و حزبِ اقتدار کا کوئی تصور نہیں ہے۔ مزید یہ کہ اسلامی ریاست ایک انتخابی عمل کے نتیجے میں وجود میں آتی ہے‘ اور موروثی حکومت یا خاندانی اجارہ داری کے نظام کو مکمل طور پر رد کرتی ہے۔ یہ تمام بادشاہتوں کو توڑ کر عوامی سیاسی عمل کے ذریعے بہترین کردار اور صلاحیت کے افراد کو منصب اقتدار پر لاتی ہے۔

اگر صرف ان تین بنیادی نکات کو سامنے رکھ لیا جائے تو اسلامی تحریکات کی تبدیلی اقتدار کی دعوت کو ''مذہبی حکومت'' (تھیاکریسی) کے ساتھ خلط ملط نہیں کیا جا سکتا۔ بیسویں صدی کے عظیم اسلامی مفکر اور مجدد سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے صاف الفاظ میں اسی بات کو یوں کہا ہے:

> رہا تیسرا جز تو اس کے بجائے یہاں قرآن اپنے جامع اور وسیع احکام کے ساتھ موجود ہے اور اس کی تشریح کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی قولی وعملی ہدایات موجود ہیں جن کی روایات میں سے صحیح کو غلط سے ممیز کرنے کے مستند ذرائع ہمیں حاصل ہیں۔ ان دو مآخذ سے جو کچھ ہمیں ملے صرف وہی من جانب اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی فقیہ‘ امام‘ ولی یا عالم کا مرتبہ نہیں ہے کہ اس کے قول وفعل کو حکم خداوندی کی حیثیت سے بے چوں وچرا مان لیا جائے۔ اس صریح فرق کے ہوتے ہوئے اسلامی ریاست کو بھی مغربی اصطلاح میں مذہبی حکومت (theocracy) کہنا قطعاً غلط ہے (اسلامی ریاست‘ ص ۴۸۰)

مغربی مفکرین ہی نہیں مغرب زدہ مسلمان دانش ور بھی خلافت اور شوریٰ کی اصطلاحات سے یہ سمجھتے ہیں‘ کہ اگر کہیں اسلامی تحریکات کامیاب ہوگئیں تو ایوان عوام ہی میں نہیں بلکہ حکومت کے دفاتر‘ پولیس‘ عدلیہ ہر جگہ الف لیلوی شخصیات مناصب پر فائز ہو جائیں گی۔ اس افسانوی طرز فکر کا علاج صرف یہ ہے کہ اسلام کی آسان تعلیمات کو براہ راست طور پر مطالعہ کر کے دیکھا جائے‘ کہ وہ کہاں تک ان خدشات کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہیں۔

مغربی مفکرین‘ اسلامی ریاست کے حوالے سے ایک اور اہم فکری غلطی یہ کرتے ہیں‘ کہ وہ اسے محض روایات (traditions اور conventions) کا مجموعہ تصور کرتے۔ مزید برآں اس غلط فہمی کے تحت دور حاضر کی بعض بادشاہتوں کو اسلام کی نمایندہ حکومتیں سمجھتے ہیں‘ اور اسلامی ریاست کے قیام کے مطالبے کو جمہوریت کے لیے خطرے کی گھنٹی قرار دیتے ہوئے حریت فکر اور آزادی اجتماع کے لیے پیغام اجل سمجھتے ہیں۔

حقیقت واقعہ اس کے برعکس ہے۔

قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلام جس ترقی پسند اور جدید ریاست کی تعلیم دیتا ہے' وہ اجتہاد کے اصول کی علم بردار ہے۔ اسی لیے شارع اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر بناتے وقت انھیں جو منشور عطا فرمایا' وہ روایت پرستی پر مبنی نہ تھا بلکہ اجتہاد کرنے کا علم بردار تھا۔

اسلامی تحریکات اور ان کی احیائی کوششوں کو اگر معروضی طور پر دیکھا جائے تو وہ فی الحقیقت اجتہادی تحریکات نظر آتی ہیں۔ یہ قانون' تعلیم' معیشت' معاشرت' سیاست' غرض ہر میدان میں اجتہاد کی بنیاد پر جدید مسائل کو حل کرنا چاہتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف روایت پسند تنظیمیں ہوں یا وہ مذہبی جماعتیں' جو اپنا تشخص اپنی مخصوص فقہی تعبیر اور مسلک سے وابستہ کرتی ہیں اور سلف کے ہر عمل کو جوں کا توں اختیار کرنے کو صحیح مذہبیت سمجھتی ہیں' وہ ہر محاذ پر اسلامی احیا کی تحریکات کے ساتھ عدم تعاون بلکہ بعض اوقات مخالفت کا رویہ اختیار کرتی ہیں۔ حتیٰ کہ دین کی جامع تعریف کو' جو کہ سیاست' عبادت' معیشت و معاشرت کے درمیان کوئی خطِ تفریق نہیں کھینچتا دین کی ''سیاسی'' تعبیر قرار دے کر نظری طور پر سیاسی معاملات میں اپنی بریت کا اعلان کرتی ہیں۔ گو عملاً وہ تمام مسلکی جماعتیں جو دین کو محض رسوم عبادت تک محدود رکھنا چاہتی ہیں جب بھی موقع ملتا ہے برسرِ اقتدار جماعتوں سے اپنے آپ کو وابستہ کرنے میں کوئی شرعی قباحت بھی محسوس نہیں کرتیں۔ اس طرح ان کی روایت پرستی ان کے خیال میں محفوظ رہتی ہے۔

مغرب اور اسلام کے علمی و ثقافتی تعامل (interaction) کو زیادہ بامعنی اور تعمیری بنانے کے لیے جہاں بظاہر مغرب کو ایک لمبا سفر طے کرنا ہوگا' وہاں خود مسلمان اہل علم کو اسلام کے بعض بنیادی تصورات اور تحریکات اسلامی کی دعوت کو معروضی طور پر قرآن و حدیث کی روشنی میں مطالعہ کرنا ہوگا۔

اس کے ساتھ ساتھ مغرب کو بعض مسلمانوں کے ان اقدامات کو جو: محدود روایت پرستی' جذباتیت یا فرقہ واریت پر مبنی ہوں' الگ رکھتے ہوئے' بالکل اسی طرح جیسے شمالی آئرلینڈ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کی باہمی جدل عیسائیت کی نمایندہ تصور نہیں کی جاتی' یہ سوچنا ہوگا کہ کیا' مثلاً طالبان سے منسوب بعض اقدامات واقعتاً اسلام اور مسلمانوں کے نمایندہ قرار دیے جاسکتے ہیں؟ کیا کسی مخصوص مسلک یا گروہ کے انفرادی اقدامات و تعبیرات کو عموم دے کر اسلام کے اصول قرار دیا جاسکتا ہے؟

مغرب کو اس پہلو کا جائزہ بھی لینا ہوگا' کہ جن جن مقامات کے حوالے سے کہا جاتا ہے کہ وہاں مسلمان قوت کا استعمال کر رہے ہیں' مثلاً کشمیر یا فلسطین' بوسنیا ہرزےگووینا یا چیچنیا' برما ہو یا جنوبی تھائی لینڈ یا فلپائن' کیا ان تمام مقامات پر مسلمانوں کی جدوجہد کی اصل حیثیت حقوق انسانی کے تحفظ کے لیے ایک دفاعی جہاد کی نہیں ہے؟ ان تمام مقامات پر' جنھیں بار بار تشدد کی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے' یہ حقیقت نظرانداز

کر دی جاتی ہے کہ مسلم آبادیاں کتنے تشدد اور ظلم وستم کا نشانہ بنتی ہیں' اس لیے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے جہاد پر آمادہ ہوتی ہیں۔ مغرب حقوق انسانی کی علم برداری کا جس طرح دعویٰ کرتا ہے اس کا تقاضا تو یہی تھا کہ ان تمام جہادی تحریکات کو ان کے صحیح سیاق میں پیش کیا جاتا۔ لیکن شاید سطحی معلومات یا ابلاغی سازش کی بنا پر ان تمام تحریکات حریت کو اسلامی جہاد کا مخصوص مغربی لیبل لگا کر عام مغربی قاری کو خائف اور اسلام اور مسلمانوں سے دُور کرنے کی شعوری کوشش کی جاتی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ مغربی اہل فکر کو معروضیت (objectively) کے ساتھ عالمی امن' حقوق انسانی' مذہبی رواداری' معاشی اور ثقافتی حقوق کے حوالے سے مسلمانوں پر عائد کردہ بہت سے الزامات کو نئے سرے سے زیر بحث لانا ہوگا' تاکہ اکیسویں صدی باہمی افہام وتفہیم کے ذریعے ان خدشات وتعصبات کی شدت میں کمی کی مثال بن سکے۔ مروجہ شبہات والزامات کی موجودگی میں کوئی بامعنی مذاکرہ اور مکالمہ اگر ہوگا بھی تو مصنوعی اور غیر مفید ہوگا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ○ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک بری موت سے بچاتا ہے ○ چھپا کر دیا جانے والا صدقہ رب کی آتش غضب بجھاتا ہے ○ اور صلہ رحمی سے عمر میں برکت ہوتی ہے۔ (ترغیب بحوالہ طبرانی)

امریکہ میں اسلام کا مستقبل

ڈاکٹر عصام العریان

ترجمہ: محمد ظہیرالدین بھٹی

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے سانحے کے بعد ایک اہم سوال یہ اُبھرا ہے کہ خود امریکہ میں اسلام کا مستقبل کیا ہوگا؟ مغرب اور عالم اسلام کے مابین تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی؟ ڈاکٹر جیفری لانگ کی کتاب کا عربی ترجمہ ''مستقبل الاسلام فی امریکا'' کے نام سے جنوری ۲۰۰۲ء میں قاہرہ سے شائع ہوا ہے (انگریزی سے عربی ترجمہ ڈاکٹر زین نجاتی نے کیا ہے)۔ موصوف ایک سفید فام امریکی مذہبی کیتھولک گھرانے میں پیدا ہوئے۔ کئی سال تک ملحدانہ زندگی گزارنے کے بعد ۸۰ کے عشرے کی ابتدا میں ۲۸ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ آپ امریکہ کی کنساس یونی ورسٹی میں ریاضی کے پروفیسر ہیں۔

دیباچہ جرمن مسلم سفارت کار ڈاکٹر مراد ہوف مین کے قلم سے ہے۔ ان کی رائے میں اس کتاب میں' امریکہ میں اور امریکہ سے باہر' مسلمانوں کی ان کوتاہیوں کو اہمیت دی گئی ہے۔ ○ امریکی معاشرے میں رائج ثقافت کو درست طور پر نہ سمجھنا۔ ○ اسلامی مکاتب فکر میں عدمِ رواداری۔ ○ عربی معاشرے کی خصوصیات کو برتر قرار دینا' حالانکہ ان کی اہمیت دینی نہیں مقامی ہے۔ عورت کے بارے میں مسلمانوں کا غیرقرآنی رویہ' مسجدوں میں عورتوں کی آمد سے ناخوش ہونا۔ ○ مسلمان کے طور پر زندگی بسر کرنے کے اسلوب میں غیرضروری اور ذیلی وثانوی چیزوں کو اہمیت دینا اور سنت رسولؐ کے اخلاقی وروحانی پہلوؤں کی پیروی کا اہتمام نہ کرنا۔ ○ نومسلم اہل مغرب کے بارے میں نسلی مسلمانوں کا عدمِ اعتماد کا تقلیدی رویہ۔

کتاب کا بنیادی مقصد' مؤلف کا اپنی بچیوں کو حقائق ایمان سے آگاہ کرنا ہے تاکہ امریکی معاشرے میں' اسلام پر قائم رہنے میں ان کی مدد کی جاسکے۔ امریکی الاصل نومسلموں کے لیے امریکہ میں رہ کر اسلام پر باقی رہنا بہت مشکل ہے۔ مؤلف نے دو امریکی نومسلموں اور ان کے خاندانوں کی داستانِ عبرت بیان کی ہے جو ایمان پر ثابت قدم نہ رہ سکے۔ ایک نے بودھ مت میں پناہ لی اور دوسرے نے الحاد کا راستہ اختیار کیا۔

شہوات، خواہشات اور لذات کی دنیا میں بسنے والوں کا عقیدۂ اسلام پر جمے رہنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کتاب کا موضوع بحث یہی ہے کہ امریکہ میں اسلام کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس مسئلے کا تعلق دوسری اور تیسری نسلوں سے ہے کہ وہ ایک طرف اسلام کے دامن کو بھی تھامے رکھیں اور دوسری طرف امریکہ میں اپنی پیدایش، وراثتی صفات وخصوصیات، سماجی عادات اور امریکی ثقافت کے تقاضوں سے بھی اپنا تعلق جوڑے رکھیں۔ جہاں تک امریکہ میں بسنے والے غیر امریکی نژاد مسلمان نسلوں کا تعلق ہے خواہ یہ تارکینِ وطن ہوں یا آج سے بہت پہلے اسلام قبول کرنے والے--- ان کے حالات بالکل الگ نوعیت کے ہیں۔

پہلے باب میں ایک ۴۰ سالہ امریکی مسلمان کی آہِ دل دوز کا ذکر ہے جو بڑے دکھ اور کرب سے کہتا ہے: میں نے اپنا بیٹا کھو دیا! یہ نوجوان ۱۶ سال کا ہوا تو ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ دوسری نسل کے امریکی مسلمانوں میں یہ المیہ بار بار رونما ہوتا ہے کہ وہ دائرہ اسلام سے نکل جاتے ہیں، مرتد ہو جاتے ہیں۔

دوسرے باب میں وحی اور اس کی عالم گیریت پر قرآنی آیات کے طویل اقتباسات دیے گئے ہیں۔ وحی مقامی زبان اور ثقافت کو استعمال کرتی ہے۔ کسی بھی معاشرے کی زبان، اس معاشرے کے تجربات کے ساتھ بڑھتی ہے اور پھیلتی ہے۔ اس زبان وثقافت کے بغیر، ان تجربات سے خارجی دنیا کے حقائق کو کیسے بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس باب میں اللہ، انسان اور زندگی جیسے اہم حقائق پر گفتگو کی گئی ہے۔ اللہ کا علمِ محیطِ کُل، تقدیر اور قبولیت دعا مغربی عقل کے لیے باعث حیرت ہیں۔ ان امور پر جیفری نے تفصیلی کلام کیا ہے۔

تیسرے باب میں غیر مسلم کے قبولِ اسلام پر مترتب ہونے والے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ایک امریکی کے قبولِ اسلام کا فیصلہ کرنے میں کیا رکاوٹیں ہیں؟ یہاں ان چند مشکلات کو بیان کیا جاتا ہے جو اُسے تارکینِ وطن مسلمانوں کے حوالے سے پیش آتی ہیں:

۱- **عربی دین**: اسلام کو ایک ''عربی دین'' سمجھا جاتا ہے، یعنی امریکہ کے لیے غیر ملکی اور اجنبی۔ لہٰذا امریکی تہذیب کے لیے ناقابل قبول۔ یہ تاثر غلط ہے، اسلام عالمی پیغام ہے مگر لوگ سمجھتے ہیں کہ مسلمان ہونے کے بعد عربی لباس پہننا ہوگا، عربی زبان بولنا ہوگی اور عربوں کی عادات و رسوم کو اپنانا پڑے گا۔

۲- **ظاہر داری**: نومسلم کے لیے یہ بات باعث تشویش ہوتی ہے کہ اسلام کے اعلیٰ اخلاقی اصولوں اور قدروں کو اپنانے جیسے بنیادی امور کے بجائے ظاہری باتوں اور شکل وصورت، مثلاً لباس کی وضع قطع، کھانا کھانے کے طریقے وغیرہ پر زور دیا جاتا ہے۔ مؤلف کے بقول: اگر ایک مسلم داعی، سادہ یورپی لباس پہن کر امریکہ میں لیکچر دیتا ہے تو وہ سنت رسولؐ سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ اس لیے کہ رسول اکرمؐ وہی لباس پہنتے تھے جو اس معاشرے کے مطابق ہوتا تھا جس میں آپؐ زندگی بسر کر رہے تھے۔

۳-**رابطے کا فقدان:** نومسلم صرف مسلمانوں ہی سے سروکار رکھتے ہیں۔ یوں وہ غیرمسلموں سے بھرے ہوئے معاشرے سے اپنے رابطے تقریباً ختم کر لیتے ہیں۔ مسلمان مغرب میں اپنی ایک الگ دنیا آباد کر لیتے ہیں اور اپنے اردگرد کے ماحول سے کٹ جاتے ہیں۔ آپ کو بہت کم ایسے مسلمان ملیں گے جو روزنامہ یا ہفت روزہ پڑھتے یا مقامی خبروں کا بلٹن سنتے ہوں۔ مقامی اور پبلک معاملات میں شرکت تو بہت دُور کی بات ہے۔

۴-**خلط ملط:** ایشیا اور بالخصوص مشرقِ وسطیٰ سے آنے والے بہت سے مسلمان اپنی مقامی ثقافتوں اور دینی احکام میں خلط ملط کر دیتے ہیں۔

۵-**عورتوں کو ناپسند کرنے والا دین:** امریکی سمجھتے ہیں کہ اسلام عورتوں سے نفرت کرنے والا دین ہے' حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اگرچہ مسلمان ملکوں کی ثقافت کو دیکھنے اور ان کا مطالعہ کرنے سے یہ تاثر اُبھرتا ہے۔ یہ تصور قبولِ اسلام میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ مؤلف کے الفاظ میں: ''میں عورت کے بارے میں' اسلامی شرعی قوانین کو' اسلام قبول کرنے کے بہت سے اہل مغرب شائقین کے لیے رکاوٹ نہیں سمجھتا مگر میرا یہ پختہ خیال ہے کہ عورتوں کے بارے میں مسلمانوں کا رویہ' قبولِ اسلام میں حائل ہے''۔

۶- **امریکہ مخالف تاثر:** مؤلف نے ایک نہایت حسّاس مسئلے پر گفتگو کی ہے کہ کچھ مسلمانوں کا خیال ہے کہ غیراسلامی حکومتوں کا تختہ اُلٹ دینا چاہیے' حتیٰ کہ امریکہ کا بھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام قبول کر کے نومسلم امریکی' عام امریکیوں کی نظر میں ففتھ کالم میں شامل ہو جائیں گے کیونکہ وہ اپنے ہی وطن کے خلاف کام کریں گے۔ مؤلف نے نومسلموں کے پرامن رویے پر کلام کرنے کے بجائے' مسلمانوں کی صفائی پیش کی ہے اور انھیں غداری' بدعہدی اور خیانت جیسے الزامات سے پاک قرار دیا ہے۔ وہ اس باب کے آخر میں لکھتا ہے: ''تاریخ میں سب سے تیزی سے پھیلنے والا دین اسلام ہے۔ اسلام مغرب میں بھی بہت تیزی سے پھیلا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کا اپنا معاشرہ بہت سے داخلی بحرانوں کا شکار ہے۔ اسلام کی روز افزوں ترقی کا راز قرآن شریف جیسی عظیم کتابِ ہدایت ہے''۔

چوتھے باب میں مؤلف نے ارکانِ اسلام کے اسرار بہت خوب صورت پیرائے میں بیان کیے ہیں۔ توحید' اذان' نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ کے مسلمانوں کی زندگی پر پڑنے والے اثرات کا ذکر ہے۔ مؤلف نے اپنی زندگی میں پہلی نماز کیسے ادا کی' اس کے تاثرات بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ اس نے اپنی تیسری بیٹی کی پیدایش کا استقبال کیسے کیا۔ موصوف نے اپنا سفرحج بھی ذوق وشوق سے بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس پر حج کا راز بنگلہ دیش کے ایک نوجوان مسلمان نے کھولا تھا۔

پانچویں اور چھٹے باب میں مولف نے امریکی مسلمانوں کے مصائب و آلام پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ وہ لکھتا ہے' جونہی ایک سفید فام امریکی اسلام قبول کرتا ہے تو یہ ایک خبر ہوتی ہے جو ہر مسلمان تک پہنچتی ہے۔ مسلمانوں کے گروپ اس نومسلم کا خیر مقدم اس طرح کرتے ہیں جیسے کوئی فرشتہ ہو۔ وہ ہر جگہ مہمانِ خصوصی ہوتا ہے۔ اُسے ہیرو سمجھا جاتا ہے' کلبوں میں گفتگو کی دعوت دی جاتی ہے۔ اس کے بعد اسے ''اُچکنے'' کی کوششیں شروع ہو جاتی ہیں۔ ہر فرقہ اور گروہ اسے اپنی طرف کھینچنے کے لیے زور آزمائی کرتا ہے۔ اس مقصد کی خاطر غیبت' وسوسہ اندازی اور دوسروں کو بدنما بنا کر پیش کرنے جیسے ہتھکنڈوں سے کام لیا جاتا ہے' جس سے یہ نومسلم ذہنی پراگندگی کا شکار ہونے لگتا ہے۔

آخری باب میں جیفری لکھتا ہے کہ اگر اسلام نے شمالی امریکہ میں زندہ رہنا اور پھیلنا ہے تو اس کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں:

۱- موجودہ امریکی مسلمانوں کے بچے بالغ ہو کر اسلام سے وارفتگی رکھیں اور پوری قوت کے ساتھ اسلام پر عمل کریں۔

۲- مسلمان معاشرہ متحد رہے' گروہوں میں نہ بٹے۔

۳- امریکی مسلم معاشرہ ایسے علماے دین تیار کرے جو آیندہ پیش آنے والے نئے مسائل کا خاطرخواہ اور ہر قسم کے سوالات کا تسلی بخش جواب دے سکیں۔

مؤلف نے امریکی مسلمانوں کی دوسری نسل سے بہت سی اُمیدیں وابستہ کرلی ہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ یہی لوگ امریکی معاشرے اور مسلمانوں کے عالمی معاشرے کے مابین پُل کا کام دیں گے اور اپنے ہم وطنوں کو اسلام کا پیغام صحیح تناظر میں پہنچا سکیں گے۔

پُرکشش اور دل چسپ اسلوب میں لکھی گئی' درمیانی سائز کے ۳۰۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ایک بار شروع کردی جائے تو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ کتاب بار بار پڑھنے کے لائق ہے۔ کتاب کا اختتام ان جملوں پر ہوتا ہے۔

> میرا یقین ہے کہ چند عملی رکاوٹوں کے باوجود اسلام جلد ترقی کرے گا اور امریکہ میں خوب پھیلے گا۔ جس طرح میں قرآن شریف کے مطالعے کے بعد' اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہوا ہوں' بے شمار اور لاتعداد امریکی اسی تجربے سے گزریں گے۔ جس وحی الٰہی نے مجھے اپنی آغوشِ رحمت میں لیا ہے' یقیناً لاکھوں دوسرے امریکی بھی اسی شیریں کیفیت سے ضرور سرشار ہوں گے۔ (ہفت روزہ المجتمع' ۵ اپریل ۲۰۰۲ء)

اخبارِ اُمت

گجرات میں مسلم کُشی: منصوبے کا ایک حصہ

پروفیسر خورشید احمد

گجرات میں جو کچھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے' یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں ہے' بلکہ یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے جس کی کچھ بنیادیں ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ مسلمان کا بحیثیت مسلمان اپنے تشخص کی صحیح حفاظت کے ساتھ' بھارت میں کوئی مستقبل نہیں ہے لیکن اگر وہ دوسرے درجے سے بھی کم تر درجے کے شہری بننا قبول کریں' یعنی یہ کہ وہ نام کے مسلمان رہیں' مسجدیں بنالیں اور نماز بھی پڑھ لیں لیکن ہندو کلچر' ہندو فلسفۂ حیات' ہندو سیاست اور ہندو کی بالادستی تسلیم کرلیں تو پھر رہ سکتے ہیں۔ اگر مسلمان ثقافتی وتہذیبی اور علمی طور پر ایک نظام زندگی یا ایک نظامِ تہذیب کے علم بردار اور ایک سیاسی اور معاشی قوت کے طور پر وجود رکھنا چاہیں تو یہ گوارا نہیں۔ ہندوشوانزم کا یہی حقیقی ٹارگٹ ہے۔ حکمت عملی کے طور پر انھیں کبھی مفاہمانہ رویہ بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔

دوسری چیز اس کا پس منظر ہے۔ راشٹریہ سیوک سنگھ (آر ایس ایس) ۱۹۲۵ء میں قائم ہوئی ہے۔ اس کا قیام مسلمانوں سے ان کے اقتدار کا بدلہ لینے کے لیے عمل میں آیا۔ بنیادی طور پر یہ ایک عسکری تنظیم ہے۔ آغاز اکھاڑے' ورزش اور لاٹھی سے ہوا لیکن اب اسلحہ اور آتش زنی کی کارفرمائی ہے۔ اس کی جڑیں مہاسبھا اور شدھی کی اہم مذہبی اور فکری تحریکوں میں تھیں: مہاسبھا فکری اور سیاسی' اور شدھی مذہبی اور تہذیبی۔ لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ جب تک عسکری' یعنی مارشل طاقت نہیں ہوگی یہ کام نہیں ہوسکتا۔ گاندھی جی کے مقاصد مختلف نہ تھے لیکن ان کا اسلوب بقاے باہمی (coexistence) کا تھا۔ انھیں بھی برداشت نہ کیا گیا اور قتل کردیا گیا۔

'بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کی فکر بقاے باہمی کی نہیں ہے' بالادستی (hegemony) کی ہے۔ ۷۰ کا عشرہ ہندستان کی تاریخ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ کانگریس جس نے آزادی کی تحریک

چلائی اور ملک پر حکومت کی تھی، وہ ٹوٹنا شروع ہوئی۔ یہ وقت ہے کہ جب ہندو قیادت نے فیصلہ کیا کہ اب ہمیں نہ سیکولرازم کی ضرورت ہے، نہ بقاے باہمی کی، بلکہ حقیقی ہدف ہندو کا مستقل غلبہ ہے۔ اس کے لیے یہ تدریج مرحلہ وار کام کیا گیا۔ بی جے پی کانگریس کے مقابلے میں اپوزیشن کی حیثیت سے پہلی مرتبہ سیاست میں داخل ہوئی اور اٹل بہاری واجپائی قابل قبول چہرے کے طور پر مخلوط حکومت میں آئے۔ اس کے بعد انھوں نے منصوبہ بنایا کہ اب ہمیں سولو فلائٹ کرنی ہے اور اصل قوت بن کر اُبھرنا ہے۔ اس کے لیے شمالی بھارت کو جو برہمن غلبے کا علاقہ ہے توجہ کا مرکز بنایا۔ اب ہندو نیشنلزم کو فکر سے آگے بڑھ کر اور سیاسی محاذ سے پیش قدمی کر کے عوامی تحریک بنانا پیش نظر تھا۔ بی جے پی، آر ایس ایس اور اس طرح کی دوسری تنظیموں نے اسی کام کو کیا ہے۔

ایڈوانی اور ٹھاکرے اصل thinker اور strategist ہیں۔ بابری مسجد کو ٹارگٹ بنا کر ذریعہ بنایا گیا۔ اصل مقصد ہندو جذبے کو متحرک کرنا اور طاقت ور بنانا تھا۔ انھوں نے بابری مسجد کو شہید کیا۔ بابری مسجد دراصل پوری تحریک تھی جس نے بی جے پی کو سیاسی طاقت بنایا۔ پارلیمنٹ میں ان کے ممبران دو سے ۸۲، اور ۸۲ سے ۱۸۰، ۱۸۰ سے ۲۱۰، ۲۱۰ سے ۲۱۸ ہو گئے۔ یہ خود مکمل کہانی ہے۔

گجرات میں جو کچھ ہوا ہے وہ دراصل اس پوری اسکیم کا ایک حصہ ہے۔ گجرات ہی نہیں، اس سے پہلے احمد آباد میں، علی گڑھ میں، بھاگلپور میں، میونڈی میں اور میرٹھ میں بھی یہی کچھ ہوا۔ جہاں کہیں بھی مسلمان کوئی قابل لحاظ حیثیت اور سیاسی اور معاشی اعتبار سے اہمیت رکھتے تھے، اسے نشانہ بنایا گیا۔ احمد آباد، گجرات، ممبئی، یہ وہ مقامات ہیں جہاں مسلمان ابھی تک معاشی طور پر مضبوط ہیں۔

میں ممبئی صرف ایک دفعہ ایک دن کے لیے گیا ہوں۔ وہاں جس ٹیکسی پر میں نے سفر کیا اس کے مسلمان ڈرائیور سے میں نے جب بات چیت کی تو اس نے کہا کہ ہم تعداد میں کم ضرور ہیں لیکن ہندوؤں سے نبٹ سکتے ہیں، اگر حکومت اور پولیس بیچ میں نہ آئے!

۱۹۹۲ء میں بابری مسجد کو شہید کرنے کے بعد سے ہندو تنظیمیں وہاں مندر بنانے کی تیاری کر رہی ہیں۔ کروڑوں، اربوں کے حساب سے رقم جمع کر لی ہے۔ اس کے سارے حصے بنا لیے ہیں۔ ہر چیز تیار ہے۔ اب وہ کوئی موقع چاہتے ہیں کہ مندر بننا شروع ہو جائے، لیکن یہ ایک پولیٹیکل ایشو بن گیا ہے۔ قانونی پہلو بھی سپریم کورٹ میں زیر بحث ہے۔

بابری مسجد کو مسئلہ بنا دیا گیا ہے، جب کہ یہ بھی تحقیق نہیں ہے کہ رام تھے بھی یا نہیں، تھے تو کہاں تھے۔ ان کی جنم بھومی کے بارے میں ایک ہزار سے زیادہ مقامات کی نشان دہی ہندو مؤرخین نے کی ہے۔ کوئی

شہادت اور ثبوت نہیں ہے کہ ظہیرالدین بابر نے کبھی بھی کسی مندر کو مسجد میں تبدیل کیا ہو۔ لیکن اب اسی بنیاد پر سارا زور وہاں مندر بنانے پر ہے۔ اعلان کیا گیا تھا کہ ہم ۱۰ سال کے اندر اندر مندر بنالیں گے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ مارچ ۲۰۰۲ء میں مندر بنے گا۔ اب واجپائی وزیراعظم اور ایڈوانی وزیرداخلہ ہیں' مندر نہیں بن سکا ہے۔ اس لیے انھوں نے یہ کیا کہ جہاں مندر کی تعمیر کی تیاریاں کی جارہی ہیں وہاں لوگ آئیں جائیں۔

اس دوران گودھرا کا واقعہ پیش آیا۔ دو ہندو صحافیوں کی تحقیق انڈی پنڈنٹ لندن میں پورے صفحے پر شائع ہوئی ہے کہ ہم نے جتنی تحقیق کی ہے' کوئی ثبوت اس کا نہیں ملا کہ باہر سے آگ لگائی گئی۔ بوگی میں موجود کوئی چیز ہی آگ لگنے کی وجہ بنی۔ لیکن مسلمانوں پر اس کا الزام رکھ کر انھیں تہ تیغ کرنا اور ان کی بستیوں کو اور کاروبار کو منظم اور سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق جلانا شروع کر دیا گیا۔ وزیراعلیٰ نریندر مودی نے کھلے عام حوصلہ افزائی کی۔ پولیس نے حملہ آوروں کا ساتھ دیا۔ جن باضمیر ہندو افسروں نے رکاوٹ ڈالی ان کے تبادلے کر دیے گئے۔

اطلاعات کے مطابق اس وقت تک ۴ ہزار سے زیادہ افراد شہید ہو چکے ہیں۔ ایک ہزار سے زائد خواتین کے ساتھ زیادتی ہوئی' سیکڑوں مسلمان جلائے گئے ہیں۔ بستیوں کی بستیاں جلا دی گئیں ہیں' اور ایک لاکھ سے زیادہ افراد بے گھر ہو گئے ہیں۔ کیمپوں کا برا حال ہے۔ اب تو دو مہینے ہو رہے ہیں لیکن مسلمانوں کو ان کے گھروں کو واپس نہیں آنے دیا جا رہا۔ مسلسل حملے جاری ہیں۔ دوسری طرف بھارتی حکومت کی پالیسیوں کو دیکھیں' انھیں دنیا کو دکھانے کے لیے بھی کچھ کہنے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بے باک طریقے سے مسلمانوں کی نسلی صفائی میں مصروف ہیں۔

یہ ایک عالمی اور نظریاتی مسئلہ ہے۔ اس میں سب سے زیادہ قابل افسوس کردار پاکستان کا ہے جس نے اس مسئلے کو محض ایک بیان سے زیادہ کے قابل نہیں سمجھا اور بھارت کو ناراض نہ کرنے کی خاطر درست پالیسی اختیار نہ کی۔ اس طرح دوسرے ممالک کو بھی جواز دیا کہ جب پاکستان ہی کچھ نہیں کر رہا تو وہ کیا کریں۔ او آئی سی نے بھی خاموشی اختیار کی۔ مسلم ممالک نے بھی کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ فلسطین میں مظالم ہو رہے ہیں۔ ہم پوری طرح ان کے ساتھ ہیں۔ لیکن یہ ظلم بھی اسی طرح کا ظلم ہے۔ اس کی مذمت کیوں نہیں کی جاتی؟

پاکستان کی ذمہ داری اس معاملے میں سب سے زیادہ اس لیے ہے کہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو تقسیم ملک کی جو اسکیم بنی اس کا ایک حصہ یہ تھا کہ جو دو آزاد ممالک قائم ہو رہے ہیں' دونوں اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ یہ اپنے اپنے ممالک کے اندر اقلیتوں کو مکمل تحفظ دیں گے۔ یہ ایک دوسرے کی ذمہ داری ہوگی۔ پاکستان

اور ہندستان کے قیام کا جو چارٹر ہے یہ اس کا ایک حصہ ہے۔ ۱۹۴۹ء میں پہلے فسادات کے بعد لیاقت نہرو معاہدہ ہوا جس میں دونوں کے دستخطوں سے یہ اصول لکھا ہوا ہے کہ پاکستان کی حکومت بھارت کے مسلمانوں میں interested ہوگی اور بھارت کی حکومت پاکستان کے ہندوؤں میں۔

تقسیم سے قبل قائداعظم سے یہ بنیادی سوال پوچھا گیا کہ آپ کا بنیادی موقف یہ ہے کہ برعظیم میں مسلمانوں کا مسئلہ حل ہوگا۔ لیکن پاکستان بن جائے گا تو پاکستان میں تو ہوگا' ہندستانی مسلمانوں کا کیا ہوگا؟

قائداعظم نے کہا کہ مسئلہ پورے برعظیم کے مسلمانوں کا ہے۔ یہ مسئلہ اس طریقے سے حل ہوگا کہ پاکستان نہ صرف ان لوگوں کو تحفظ دے گا جو وہاں ہوں گے بلکہ وہ برعظیم کے مسلمانوں کے تحفظ کے لیے ذریعہ بنے گا۔ یہ بات تقسیم کے منصوبے کا حصہ ہے۔ اور بھارت میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ نہ ہوا تو ہم اپنا مداخلت کا حق (right of intervention) محفوظ رکھتے ہیں۔ یہ مہذب دنیا کا ایک اصول ہے۔

پاکستان کا قیام اور آزادی ایک معاہدۂ عمرانی کی بنیاد پر عمل میں آئی ہے۔ تقسیم کی اسکیم کا ایک عمرانی پہلو ہے۔ دو قوموں کے درمیان باہمی تفہیم ہوئی ہے اور قائداعظم نے بھی یہی بات کی ہے۔ ہماری حکومت کو اپنی ذمہ داری محسوس کرنا چاہیے!

مصر انقلاب کے دوراہے پر

جینوی عبدو°

شرق اوسط کے سیاسی و سماجی امور میں دل چسپی رکھنے والوں کے لیے یہ پہلو خاصی توجہ کا مرکز ہے کہ: مصر میں اسلامی تحریک احیا اور اسلام کے حرکی تصور کا کیا مستقبل ہے؟ کیا واقعی مصر اسلام کی طرف بڑھ رہا ہے؟ کیا مصر کا موجودہ سیکولر حکمران گروہ' مستقبل میں بھی اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط رکھ سکے گا' یا سیکولر مصر آہستہ آہستہ اسلامی مصر کے راستے پر چل نکلے گا؟

میں نے دوران تعلیم مصر کی شہری اور دیہی آبادی کے ذوق' جذبات اور اُمنگوں کو جس قدر قریب سے دیکھا ہے' اس کے بعد میں برملا یہ بات کہہ سکتی ہوں کہ: اسلامی تحریک احیا اور عسکریت پسند مسلمانوں کی جانب سے مصر میں ایک قابل ذکر چیلنج اُبھر رہا ہے۔ ایسا چیلنج جس سے شرق اوسط میں مغربی مفادات کو صدمہ

° لبنانی نژاد مسیحی ریسرچ اسکالر

پہنچنے کا پورا پورا امکان موجود ہے۔ مصر کے دیہات اور محلوں سے' اسکولوں اور بازاروں سے ایک ایسی اسلامی تحریک برگ و بار لاتی اور بڑی تیزی سے آگے بڑھتی دکھائی دے رہی ہے جس کی جڑیں عوامی سطح پر بآسانی محسوس کی جاسکتی ہیں۔

اس تحریک نے مصری معاشرے کے تمام عناصر کو مخاطب کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اسلامی تحریکِ احیا کے حامی مصری مسلمان' کسی تشدد اور توڑ پھوڑ پر مبنی تحریک کے بغیر ہی' سیکولر مصر کی قیادت کا تختہ اُلٹنے اور اسلامی سماجی تصورات کے مطابق ایک اسلامی مصر کا پیکر ڈھالنے کا عزم رکھتے ہیں۔

مصر میں موجودہ اسلامی پیش رفت دراصل تین طاقت ور لہروں کا ثمر ہے۔ پہلی لہر ۱۹ویں صدی میں جمال الدین افغانی اور مفتی عبدہ کے افکار کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ دوسری لہر اخوان المسلمون کی جانب سے مصری روایات میں اسلامی افکار و عمل کی آبیاری سے تعلق رکھتی ہے۔ تیسری لہر اگرچہ تشکیلی دور سے گزر رہی ہے' تاہم اس میں اسلامی احیا کے تین فعال گروہوں کی فعالیت دیکھنے میں آتی ہے۔ ان گروہوں میں پہلا گروہ اپنی اعتدال پسندی اور میانہ روی کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے' جو اخوان المسلمون کی دوسری نسل پر مشتمل ہے' اور اس گروہ کی جڑیں خاصی گہری ہیں۔ دوسرے گروپ میں علماے کرام کے مختلف عناصر سرگرم ہیں' جب کہ تیسرے گروپ میں جماعۃ الاسلامیہ اور جہاد کے عسکریت پسند شامل ہیں۔

مصری طلبہ کی فعالیت (activism) نے' مصر کی جدید تاریخ بنانے میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ ۱۹۵۲ء سے جون ۱۹۶۷ء تک کا واحد زمانہ ہے' جب طلبہ نے مرکزی حکومت کی تائید و حمایت کی۔ صدر جمال کی موت [م: ۱۹۷۰ء] کے بعد' نئے صدر انور السادات نے جس کے تحت ۱۹۷۱ء میں وہ پالیسی اختیار کی گئی جس کے تحت اخوان المسلمون کے اسلام دوست کارکنوں کی رفتہ رفتہ رہائی عمل میں لائی جانے لگی۔ ان لوگوں میں اخوان کے وہ قیدی بھی شامل تھے' جنھیں گذشتہ سات سے ۱۵ برس کے دوران سخت قید تنہائی میں رکھا اور بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ ان اسلامی عناصر کی رہائی سے یونی ورسٹی کی سطح پر کمیونسٹوں اور الحاد پسند عرب قوم پرستوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کیوں کہ جب اخوان کے کارکنوں نے دہشت اور پکڑ دھکڑ کی فضا سے نجات پائی تو انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے جدید اداروں میں' اسلام کو بحیثیت ضابطۂ حیات پیش کرنے میں بڑی سرگرمی سے کام لیا۔ ان کی یہ کوششیں الحاد و دہریت اور اشتراکیت کے لیے چیلنج بن کر اُبھریں۔ پھر اخوان کی دعوتی کاوشوں سے پاپ موسیقی' جنسی بے راہ روی' عورتوں میں مغرب پسندانہ آزاد روی اور معاشرے میں مغربی کلچر کے جملہ پہلوؤں کے نفوذ پر ایک کاری ضرب لگی۔

۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۷ء تک کے زمانے میں مصری یونی ورسٹیوں میں طالب علموں کی تعداد ۲ لاکھ سے بڑھ کر ۵ لاکھ ہوگئی۔ دوسری جانب ان یونی ورسٹیوں اور اعلیٰ پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں کی اسٹوڈنٹس یونینوں

کے عام انتخابات میں اخوان المسلمون کے حامی طلبہ کو نمایاں کامیابیاں حاصل ہونا شروع ہوئیں۔ اس طرح عملاً طلبہ کی تنظیم اور قیادت پر اسلام دوست عناصر اپنی گرفت مضبوط بنانے میں سبقت لے گئے۔

اسی اثنا میں ''عصر حاضر میں اسلام اور معاشرتی زندگی'' جیسے موضوعات پر بڑے جان دار مباحث اُٹھے اور محاضرات منعقد ہوئے۔ اخوان المسلمون نے عورتوں کی سماجی حالت اور اسلام میں ان کے حقوق پر کھلے عام بحث میں حصہ لیا۔ انھوں نے کسی مداہنت یا پسپائی کا راستہ اختیار کرنے یا کسی ایک فقہی رائے پر جمے رہنے کے بجائے' مقامی رسم و رواج اور قرآن و سنت کے مطابق عورتوں کی حیثیت اور حقوق کو الگ الگ کر کے نمایاں کیا۔ جس کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ نچلے طبقوں کے علاوہ درمیانے اور اعلیٰ طبقے کی خواتین بھی' اسلامی تحریک کی طرف متوجہ ہونا شروع ہوئیں۔ یاد رہے کہ مصر کی معاشی زندگی میں درمیانے اور اعلیٰ طبقے کی خواتین کا اہم کردار پایا جاتا ہے۔ جدیدیت اور اسلامیت کی اس کش مکش میں مصری خواتین کے ہاں حجاب اور نقاب کی قبولیت نے واضح طور پر پیش رفت کی۔ اس اعتبار سے پردے کی واپسی مصر میں اسلامی تہذیب و ثقافت کے پھیلاؤ کا ایک نمایاں پہلو بن کر اُبھرا' جس سے آیندہ کے رجحانات کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔

اگر یہ کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا کہ مصر میں' اسلامی انقلاب پُرامن اور خاموش ہے لیکن قدرے تیز رفتاری سے قدم بڑھا رہا ہے۔ اس انقلاب کے قدموں کی چاپ سننی ہو تو مصر میں مختلف پیشہ ورانہ تنظیموں' سماجی انجمنوں' اور نچلی سطح پر بلدیاتی اداروں میں اسلام دوست لوگوں کی کامیابی یا ان کے اثر و رسوخ کو دیکھ لیا جائے۔ شادی بیاہ اور سماجی زندگی میں بھی یہ لوگ نمایاں طور پر اپنے اثرات کے ساتھ پیش قدمی کر چکے ہیں' جب کہ معاشرے میں ان کے لیے احترام اور پسندیدگی کو کھلے عام محسوس کیا جا سکتا ہے۔

جامع الازہر کے علما کا احترام بھی وسعت پذیر ہے۔ مصر کی ۶۷ ہزار سے زائد مساجد بھی اسلامی تشخص کو تقویت پہنچا رہی ہیں۔ عوامی دباؤ کے نتیجے میں ۱۹۸۰ء کے دوران صدر انور سادات کی حکومت نے ایک آئینی ترمیم کے ذریعے یہ اصول تسلیم کر لیا تھا کہ ''اسلامی شریعت ریاستی قانون سازی کا ماخذ ہوگی''۔

اسی تناظر میں اکیسویں صدی کا مصر' اسلامی احیا کے دوراہے پر ہے' جہاں ایک جانب استعماری مزاج اور تعلقاتِ کار رکھنے والی حکومتیں ہیں' تو دوسری جانب اسلامی احیا کے علم برداروں کی بڑھتی ہوئی وہ قوت ہے' جسے کچھ لوگ عسکریت پسند کہتے ہیں' اور کچھ انھیں روشن خیال اور وسیع المشرب اسلامی انقلابیوں کے نام سے پہچانتے ہیں۔ امریکہ اور مغرب کی جانب اٹھنے والی مخالفانہ لہر اور فلسطین میں اسرائیلی مظالم نے تبدیلی اور انقلاب کی اسلامی قوتوں کو مزید استحکام عطا کیا ہے۔ (No God But God: Egypt and The Triumph of Islam ناشر: آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس' ۲۰۰۰ سے ماخوذ: سلیم منصور خالد)

جون 2002ء

رسائل و مسائل

تحریکی ذمہ داری سنبھالنے پر

تحریکی ذمہ داری سنبھالنے پر رہنمائی کے لیے لکھے جانے والے ایک خط کے جواب میں محترم خرم مراد مرحوم نے ذمہ داران کے لیے کچھ بنیادی باتیں تحریر کی تھیں' افادہ عام کے لیے پیش کی جا رہی ہیں۔ (ادارہ)

اللہ تعالیٰ نے آپ کے سر ایک بڑی ذمہ داری ڈال دی ہے اور اس کی توفیق و نصرت ہی سے یہ بوجھ اٹھایا جا سکتا ہے۔ میری طرف سے دعا اور جو تعاون ممکن ہو' وہ حاضر ہے۔

اپنی ذمہ داری کا احساس' اور صحیح احساس ہی بنیاد کا پہلا پتھر ہے۔ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ' ''تم میں سے ہر شخص نگراں ہے' اور تم میں سے ہر شخص سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا''۔ میں اس ذمہ داری کا کوئی ہولناک نقشہ کھینچ کر آپ کے ناتواں دل اور وجود کو کسی ضعف اور بیچارگی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ سب سے بڑھ کر تو اس ذمہ داری کے لیے عزم' ہمت اور حوصلہ درکار ہے۔ اور ذمہ داری کا صحیح احساس' مایوسی کا نہیں' اِن ہی اعلیٰ صفات کا مخزن ہے: بارش کے پہلے قطرے کی طرح! اس لیے بس اتنا کہوں گا کہ جس حلقے یا علاقے کے آپ ذمہ دار ہوئے ہیں' اس کے مرد و زن کی کل آبادی تک اللہ کا پیغام پہنچانے کا کام' آپ کا کام ہے۔ آپ کا نظم اس کے لیے مسئول ہے اور آپ اس کے سربراہ ہیں۔ مسئولیت کے اس احساس سے تو نبیؐ کا دل بھی پگھل کر آنکھوں کی راہ بہہ نکلا تھا۔ اسی لیے میں نے کہا کہ میں ذمہ داری کا پورا نقشہ کھینچ کر آپ کے دل کو کسی فتنے میں نہیں ڈالتا۔ لیکن جو دل احساس ذمہ داری کی آنچ سے پگھلتا ہے' وہی اس سانچے میں ڈھلتا ہے جس میں فولاد کا عزم اور پہاڑوں جیسا حوصلہ ہو اور وہی رب کو محبوب ہے۔

ذمہ داری کے صحیح احساس کے ساتھ' جب خوب سے خوب تر کی آرزو اور جستجو بھی شامل ہو جائے' تو یہ نسخۂ کیمیا مشتِ خاک کو سونے کا ہمالہ بنانے کے لیے کافی ہے۔ ہر واقعے سے' ہر لمحے سے' ہر نئے دن سے' اپنوں سے بھی اور دشمنوں سے بھی' کامیابیوں سے بھی اور ناکامیوں سے بھی' اپنے سے بہتر لوگوں سے بھی

اور اپنے سے کم تر لوگوں سے بھی، قوی اور اعلیٰ سے بھی اور ضعیف و ادنیٰ سے بھی، سیکھنا اور سیکھتے چلے جانا، یہ تعلیم کا وہ عمل ہے جس سے زیادہ وسیع اور موثر کوئی اور عمل نہیں۔ پھر اپنے قول و فعل میں، اپنے اندر اور باہر اور اپنی تنظیم اور ساتھیوں اور اپنے مستقبل کے خوابوں میں، خوب سے خوب تر کے حصول کی مستقل کاوش اور جدوجہد، احساسِ ذمہ داری اور مقامِ احسان کی طلب و سعی---بس یہی درکار ہے!

آپ نے کتابوں کے بارے میں پوچھا ہے تو سب سے بڑھ کر تو وہ کتاب ہے جس میں وہ سب کچھ ہے جس کی آپ کو ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اللہ کن کو محبوب رکھتا ہے، کون مرتبہ احسان پر فائز ہیں--- اس کے علاوہ اور کس تعلیم کی ضرورت ہے! پھر یہی کتاب اس کے روبرو کر دیتی ہے جس کے وجہ کریم پر نظر کی لذت ہی میں سب کچھ مضمر ہے۔ اسی لیے ولذة النظر الی وجهك الكريم کی دعا حضورؐ مانگا کرتے تھے۔ قرآن ہی اس کے حصول کا ذریعہ ہے ؎

در سخن مخفی منم چو بوئے گل در برگ گل ہر کہ دیدن میل دارد، در سخن بیند مرا

میں کلام میں پوشیدہ ہوں جیسے پھول کی خوشبو پھول کی پتی میں ہوتی ہے۔ جو شخص مجھے دیکھنا چاہتا ہے، وہ مجھے کلام میں دیکھے۔

کتاب اللہ کے بعد کتاب ضمیر کو سنیے اور پڑھیے۔ اسی کو حضورؐ نے ''واعظ الله فى قلب كل مومن'' کہا ہے۔ آئینہ دل کو صیقل کیجیے، اپنے قلب کو مقام افتا پر پہنچایئے۔ اس کا ذریعہ بھی کتاب اللہ ہے کہ وہی مرشد صامت ہے اور وہی آئینہ قلب کے لیے صیقل ہے اور وہی اس کی معلم ہے۔ یہ دو کتابیں جس کے پاس ہوں، اس کے لیے سفر کچھ مشکل نہیں۔ اس کے بعد جتنے لمحات حضورؐ کی صحبت میں بسر کر سکیں، کیجیے، آپ کی ہر ادا کو دیکھیے، دل پر نقش کر لیجیے۔ صرف ظاہری ہی نہیں باطنی بھی، صرف فقہی احکام ہی نہیں اخلاق حسنہ و کریمانہ بھی۔

اپنی کتابوں کا مشورہ دینا کچھ اچھا تو نہیں لگتا، لیکن میرا خیال ہے کہ چند تصویریں: سیرت کے البم سے، اسلامی قیادت، کارکنوں کے باہمی تعلقات اور مسائل و افکار فائدے سے خالی نہ ہوں گی۔ ترجمان القرآن کے اگست ۱۹۹۱ء (تحریک اسلامی: دعوت اور تقاضے) اور اکتوبر ۱۹۹۲ء (فریضہ اقامت دین اور اس کے تقاضے) کے اشارات، اور نومبر ۱۹۹۲ء کا پورا شمارہ (خصوصی اشاعت، اسلامی نظامِ جماعت) مفید پائیں گے۔

یہ یاد رکھیے کہ تنظیم ذریعہ ہے، اصل چیز مقصد ہے۔ ذریعہ مقصد کے لیے ناگزیر ہے لیکن وہ خود مقصد نہ بن جائے۔ پھر اس ناگزیر ذریعے کی حفاظت بھی ضروری ہے۔ خصوصاً اس پُرفتن دور میں جب اچھے اچھے

لوگوں کے پاؤں پھسل رہے ہیں۔ سوے ظن، بلاثبوت یقین، بلاتحقیق و ثبوت نقل، غیبت، ان کو تو اپنے ماحول میں شراب، سود اور زنا سے بڑھ کر نفرت انگیز بنانے کی کوشش کیجیے۔ اگر ہم چند منتخب لوگوں کے معاشرے کو بھی ان برائیوں سے پاک، صاف اور ستھرا اور رحماء بینھم کا مظہر نہ بنا سکے تو اپنے معاشرے کو اور عالم انسانیت کو کیا دے سکیں گے!

کرنے کی باتیں تو بہت ساری ہو سکتی ہیں۔ آخری بات اور سب سے اہم بات یہی کہنا چاہوں گا کہ مستقبل خطرات سے بھی پُر ہے اور امکانات سے بھی۔ ہمارے حصے میں جو کچھ آئے گا وہ ہمارا کیا ہوا ہی ہوگا۔ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ○ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ○ (النجم ۵۳:۳۹-۴۰) ''اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے، اور یہ کہ اس کی سعی عنقریب دیکھی جائے گی''۔

اگر ہم تاریخ کی گزرگاہوں پر ایک نقشِ برآب، ایک تالاب، ایک کھنڈر بن کر رہ گئے تو ہمیں خود ہی کو ملامت کرنا ہوگی، ورنہ خالق تاریخ نے تو مستقبل کے پردے میں سارے خزانے ہمارے لیے رکھ دیے ہیں۔ جو ''مکہ'' میں قلت تعداد کے باوجود ''عرب و عجم'' کے مالک ہونے کا، راہ ہجرت میں ''کسریٰ کے کنگن'' پہننے کا، جب مدینہ کو سارے عرب نے گھیر کر اس کا محاصرہ کر رکھا ہو اس وقت کدال کی ہر ضرب پر ''قیصر و کسریٰ کے خزانوں'' کا خواب نہ دیکھ سکتا ہو، نہ دکھا سکتا ہو، وہ دنیا میں کوئی بڑا کام انجام نہیں دے سکتا۔ رفیق عزیز! دن میں بڑے بڑے اونچے اونچے خواب دیکھنا سیکھیے۔ اس کے لیے نگہ بلند چاہیے۔ ان خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بڑی مجتہدانہ اور تخلیقی صلاحیت اور بڑی وسعت قلب و نظر درکار ہے، اتنی وسعت جس میں آسمان و زمین سما جائیں۔ تب ہی آپ اس جنت کے ''اصحاب'' میں شامل ہوں گے جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے: سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لا (الحدید ۵۷:۲۱) ''دوڑو اور ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے رب کی مغفرت اور اُس جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین جیسی ہے''۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اس ذمہ داری کو بطریق احسن پوری کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ہمیشہ اس کی مدد پر بھروسا کیجیے اور اس کی نافرمانی سے بہت بچیے۔ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ○ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى ○ (النزعت ۷۹:۴۰-۴۱) ''اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا تھا، جنت اس کا ٹھکانا ہوگی''۔

اب اپنی ذات کو بھول کر دوسروں میں خود کو گم کر دیجیے، تو اپنا اور اپنی بہتری کا سراغ آپ وہیں پائیں گے۔ (خرم مراد، ۱۹۹۲ء)

قرضِ متبادل پر مبنی ایک بلاسود اسکیم

س: قرضِ متبادل پر مبنی ایک اسکیم بلاسود بنک کاری کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ اس اسکیم میں دو فریقوں کے درمیان دو ایسے بلاسود قرضوں کا تبادلہ ہوتا ہے جن کی رقم اور مدت کا حاصل ضرب برابر ہو۔ مثال کے طور پر اگر کسی تاجر کو ایک سال کے لیے ۱۰ لاکھ روپے قرض چاہیے تو وہ بنک کو ایک لاکھ روپے ۱۰ سال کے لیے قرض دے۔ بنک اسی وقت اسے ۱۰ لاکھ روپے ایک سال کے لیے قرض دے دے گا۔ تاجر ایک سال بعد بنک کو ۱۰ لاکھ روپے واپس کرے گا اور بنک تاجر کا ایک لاکھ روپیہ ۱۰ سال بعد واپس کرے گا۔ ۱۰ سال کے دوران بنک تاجر سے لی ہوئی رقم کاروبار میں لگا کر اپنا خرچ اور منافع کمائے گا۔

قرضِ متبادل کے شرعاً جائز ہونے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ: (الف) قرض کی رقم پر اضافی رقم کا حصول ربا ہے، جو قرضِ متبادل میں نہیں ہوتا۔ (ب) حدیث کے مطابق قرضِ متبادل کا بین طور پر شرعاً جائز ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس میں کوئی ایسی شرط نہیں ہوتی جو کسی حرام کو حلال یا حلال کو حرام کرتی ہو۔ (ج) قرضِ متبادل میں کوئی مالی اضافہ کسی وجہ سے بھی نہیں ہوتا۔ (د) قرضِ متبادل میں دونوں قرضوں کی اصل رقم ہی بلاکسی اضافے کے وصول کی جاتی ہے۔ (ہ) یہ قرضِ مشروط بھی نہیں۔ کیونکہ اس کے دونوں قرض ایک دوسرے سے مشروط تو ہیں لیکن بیک وقت لیے اور دیے جانے کے باوجود دونوں کے عقد الگ الگ ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثرانداز نہیں ہوتے۔

کیا یہ اسکیم شرعاً جائز ہے؟ یہ سودی قرض ہی کی کوئی متبادل شکل تو نہیں ہے؟

ج: قرضِ متبادل کی پیش کردہ اسکیم قرضِ حسن کی صورت قطعاً نہیں بلکہ قرضِ مشروط بالقرض ہے۔ فریق اول (بنک) قرض لیے بغیر قرض نہیں دے گا۔ یہ صورت سود کی متفق علیہ تعریف "کل قرض جر نفعًا فھو ربا" کی رُو سے سود ہے۔ بنکوں کے سامنے قرضِ متبادل کی اسکیم پیش کر کے یہی تصور تو دیا جا رہا ہے کہ اس اسکیم کے مطابق جتنی مدت کے لیے بنک قرض دیں گے اس میں بنک کو نفع ہے۔ تھوڑی مدت کے لیے زیادہ رقم کے عوض میں، یا زیادہ مدت کے لیے تھوڑی رقم، جو بنک بطور قرض لیں گے یہی تو وہ نفع ہے جو قرض کے عوض میں بنک حاصل کرے گا۔ اسے اپنے قرض کے عوض میں متبادل قرض لینے میں زیادہ نفع نہیں ملے گا جس کا دعویٰ کیا جا رہا ہے تو اسے سود کا متبادل کیسے قرار دیا جا سکتا ہے اور بنک اسے کیسے سود کا متبادل سمجھ کر اختیار کرنے کے لیے تیار ہوگا، جب کہ بنک کے لیے اس میں کوئی مالی اضافہ یا نفع بھی نہیں ہے۔ اس اسکیم

میں یہ بات بھی تسلیم کی گئی ہے کہ قرضِ متبادل کے دونوں قرض ایک دوسرے سے مشروط تو ہیں لیکن بیک وقت دیے اور لیے جانے کے باوجود دونوں کے عقد بالکل الگ ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر اثرانداز نہیں ہوتے۔ ہماری رائے میں مشروط ماننے کے بعد سودی ہونے کی بنیاد کا اعتراف کرلیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دونوں عقدوں کی تحریریں الگ الگ ہوں۔

یہ اسکیم علما کے لیے بھی قابل قبول نہیں ہے کہ اس میں ربا ہے یا کم از کم ربیہ ہے۔ اسی لیے اسلامی نظریاتی کونسل نے بھی اسے مسترد کر دیا ہے۔ بنکوں کے لیے بھی یہ نظام قابل قبول نہیں اس لیے کہ بنک کا مقصد محض ربا یا ربیہ کا کاروبار نہیں بلکہ معقول مقدار میں منافع کمانا ہے جو اس اسکیم سے اسے حاصل ہوتا نظر نہیں آتا۔ ایسا منافع تو شرکت و مضاربت کی صورت میں مل سکتا ہے اور شرکت و مضاربت ہی فی الحقیقت سود سے بڑھ کر نفع بخش اسکیم ہے۔ (مولانا عبدالمالک)

غزالی ایجوکیشن ٹرسٹ پاکستان کے زیر اہتمام
بیرونِ ملک مقیم پاکستانی طالبات اور خواتین کے لئے
تربیت، تفریح اور تنظیم کے حسین امتزاج پر مبنی منفرد

[illegible]

برائے اوورسیز پاکستانی طالبات

15 تا 31 جولائی 2002ء

دخترانِ اسلام اکیڈمی و کالج مری

نمایاں خصوصیات

- ★ ترجمہ و تجوید قرآن کے ساتھ تفسیر قرآن کا اہتمام
- ★ مری کی حسین اور خوبصورت وادیوں میں تفریحی ٹورز
- ★ مختلف ممالک کے سماجی، معاشرتی اور تعلیمی حالات و تجربات کا تبادلہ
- ★ حدیث، فقہ اور آدابِ زندگی پر مشتمل منتخب نصاب
- ★ گروپ ڈسکشن، تحریری و تقریری صلاحیتوں کی نشوونما
- ★ قائدین تحریک اسلامی اور معروف اہل علم کی صحبت سے استفادہ کے مواقع

منفرد پہلو

- طالبات کے ساتھ ان کے والدین کے لئے بھی شرکت، رہائش اور قیام و طعام کا خصوصی اہتمام۔
- تحریک اسلامی کے معروف رہنما اور مدرس پروفیسر عرفان احمد چوہدری کی زیر نگرانی فہم قرآن و سنت کلاس اور توسیعی لیکچرز۔

قواعد و ضوابط

- ☆ طالبات کی کم از کم قابلیت میٹرک / ایف اے ہونا چاہیے۔
- ☆ شرکاء کے لئے ناظرہ قرآن پاک پہلے سے پڑھا ہوا ہونا چاہیے۔
- ☆ پانچ سال سے کم عمر بچوں کو بلا فیس والدین کے ساتھ ایڈجسٹ کیا جائے گا۔
- ☆ اہل خانہ کی اجتماعی شرکت کی صورت میں 10% رعائت ہوگی۔
- ☆ پندرہ روزہ کورس کے جملہ قیام و طعام کی فیس -/4000 روپے فی کس ہوگی۔
- ☆ زیادہ طالبات کی صورت میں شرکاء کو دو گروپس میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

کورس میں داخلہ کے خواہشمند والدین و طالبات 15 جون سے قبل اپنی درخواست معہ کورس فیس بذریعہ چیک / بنک ڈرافٹ کیمپ کوآرڈینیٹر کے نام اکاؤنٹ نمبر 11678/8 نیشنل بنک آف پاکستان مری میں ارسال کر دیں تاکہ انتظامات و سہولیات کو شرکاء کے پیش نظر خاطر خواہ بنایا جاسکے۔ تاخیر سے وصول ہونے والی درخواستوں پر غور نہ کیا جائے گا۔

برائے رابطہ و معلومات

حاجی غلام نبی عباسی (کیمپ کوآرڈینیٹر)

کیمپ آفس: دخترانِ اسلام اکیڈمی، ڈاکخانہ کلفڈن لوئر بانسرہ گلی، تحصیل مری ضلع راولپنڈی۔ فون نمبر: 0593-460003

رابطہ آفس: غزالی کالج برائے خواتین بہارہ کہو مری روڈ اسلام آباد۔ فون: 2230092 فیکس: 2232085

E-mail:getpak@hotmail.com,gcwpk@yahoo.com,Website: www.ghazali.edu.pk

کتاب نما

پاکستان: حال اور مستقبل، قاضی حسین احمد۔ ناشر: منشورات، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ صفحات: ۱۴۷۔ قیمت: ۷۰روپے۔

پاکستان کی نصف صدی کی تاریخ میں حکمرانوں، مقتدر لوگوں، سیاسی پارٹیوں کے عہدے داروں اور ذمہ داروں میں سے، بہت کم لوگ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے قومی اور ملی امور و مسائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور و فکر کیا ہو اور احوال و واقعات کو صحیح سمت میں چلانے کے لیے موثر تدابیر تجویز کی ہوں۔ زیادہ تر لوگوں کی دل چسپی برسر اقتدار رہنے اور اقتدار کے مادی فوائد سمیٹنے سے رہی --- اس پس منظر میں زیرنظر مجموعۂ مضامین بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں پاکستان کی ایک اہم سیاسی و دینی جماعت کے راہنما نے، اپنے علم و مطالعے اور عملی سیاست کے تجربات کی روشنی میں موجودہ ملکی حالات پر تبصرہ کیا ہے اور وطن عزیز مختلف سطحوں پر جس بحران سے دوچار ہے، اس کی وجوہ کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ بڑی بالغ نظری سے مستقبل کی حکمت عملی پر بھی کلام کیا ہے۔

قیدِ تنہائی بالعموم فرد کے لیے باعث اذیت ہوتی ہے لیکن قاضی حسین احمد صاحب کے لیے چار ماہ کی اسیری اس اعتبار سے ایک نعمت ثابت ہوئی کہ انھیں زمانۂ اسارت میں یکسوئی کے ساتھ قومی و ملی اور عالمی مسائل پر قلم اٹھانے کا موقع مل گیا۔ یہ مضامین ۴ نومبر ۲۰۰۱ء سے ۲۷ فروری ۲۰۰۲ء کے درمیانی عرصے میں لکھے گئے۔

۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے حادثے نے ساری دنیا کی سیاست اور معیشت پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ افغانستان تو تباہ و برباد ہوا، پاکستان کو بھی کڑی آزمایشوں کا سامنا ہے۔ چنانچہ کتاب کا بڑا موضوع اسی صورت حال کے نتائج و عواقب سے متعلق ہے۔ قاضی صاحب کا خیال ہے کہ یہ سب یہودی دماغ کی منصوبہ بندی ہے اور یہود نے مغرب، خصوصاً امریکہ کو عالم اسلام کی بربادی کے لیے بڑی ہوشیاری سے آلۂ کار بنایا ہے۔ مغرب اس وجہ سے آلۂ کار بنا کہ اول تو وہ پنجۂ یہود کی گرفت میں ہے، دوسرے اُسے عالم اسلام کی بیداری اور اتحاد

کے امکانات' انسانی مسائل کے حل میں مغربی تہذیب کی ناکامی' اور یہودی ریاست اسرائیل کے مخدوش مستقبل کی وجہ سے طرح طرح کے خدشات لاحق تھے' اور مغرب چاہتا تھا کہ عالم اسلام خصوصاً اسلامی تحریکوں کو حقیقی "خطرہ" بننے سے پہلے ہی مہلک وار کر کے ختم کر دیا جائے۔ (ص ۳۰)

یہ تجزیہ اس لیے بجا اور صحیح ہے کہ مغربی نظامِ سرمایہ داری' معاشی وسائل کی منصفانہ تقسیم میں یکسر ناکام ہو گیا ہے۔ دولت کا بہاؤ غریبوں سے امیروں کی طرف ہے۔ امیر اور غریب ممالک میں فی کس آمدنی کا تفاوت ۱۹۶۰ء میں ایک اور ۳۰ کے مقابلے میں اب ایک اور ۷۴ ہو گیا ہے (ص ۲۶)۔ اسی بڑھتے ہوئے تفاوت کے خوف ناک نتائج سے امریکہ پریشان ہے' اس لیے اب وہ افغانستان اور وسط ایشیائی مسلم ریاستوں کے وسائل کو بھی اپنی گرفت میں لینا چاہتا ہے۔

افغانستان اور طالبان کے موضوعات پر مصنف کا تجزیہ بصیرت افروز اور چشم کشا ہے۔ انھوں نے مسئلہ افغانستان سے اپنی لمبی وابستگی اور تجربات کی روشنی میں معروضیت اور توازن کے ساتھ مختلف پہلوؤں کا تجزیہ کیا ہے اور پاکستانی وزارتِ خارجہ' افغان جہادی جماعتوں اور طالبان کے مثبت اور منفی پہلوؤں اور پالیسیوں کی نشان دہی کی ہے۔

خود پاکستان کے موجودہ بحران' تصورِ جہاد' کشمیر' جمہوریت اور اسلامی نظام پر بھی انھوں نے قلم اٹھایا ہے اور مستقبل کے لیے ایک بہتر حکمت عملی تجویز کی ہے۔ قاضی صاحب نے ہر مسئلے پر اپنی بات صراحت اور تیقن کے ساتھ کی ہے اور ان کے تبصروں' تجزیوں اور تجاویز میں پاکستان اور اُمت مسلمہ کے لیے ایک گہری محبت اور دردمندی کا جذبہ موجود ہے۔ (رفیع الدین ہاشمی)

قرآن حکیم 'ترجمہ اور وضاحت' کرنل (ر) محمد ایوب خان۔ ناشر: انجمن اشاعت قرآن' ۲۹۴ توسیع کیولری گراؤنڈ' لاہور کینٹ۔ صفحات: ۶۳۰' فی سبیل اللہ تقسیم۔

مصنف ایک عرصے سے تصنیف و تالیف کے ذریعے' اپنی استطاعت کے مطابق' دینی و تبلیغی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ متعدد دیگر تالیفات کے علاوہ' قرآن حکیم کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کر چکے ہیں۔ زیرنظر اردو ترجمے میں انھوں نے اپنے بقول: "یہ خیال رکھا کہ [یہ] لغت کے مطابق ہو"۔ ہر صفحے پر دو کالم ہیں۔ دائیں متن قرآن' جس میں یہ التزام ہے کہ ہر آیت نئی سطر سے شروع ہوتی ہے اور ترجمہ بھی آیت بہ آیت پیروں کی صورت میں ہے--- دائیں بائیں حاشیوں میں' مختصر توضیحات کی گئی ہیں۔

"عرض مترجم" کے تحت لکھا ہے: "میرا دعویٰ ہے کہ میرا اُردو ترجمہ واحد' صحیح اور رقت آمیز ترجمہ ہے

اور میرے انگریزی ترجمے کے متعلق ایک عالم نے کہا ہے کہ اس کے مقابلے میں پہلے سب ترجمے فرسودہ ہیں---'' ہماری رائے میں جو لوگ خدمت دین کے جذبے سے کام کر رہے ہوں' ان کے لیے اس طرح کے دعوے مناسب نہیں۔ بلاادّعا اور انکسار کے ساتھ کام کرنا زیادہ باوقار طریقہ ہے' تاہم مترجم کا یہ اعلان لائق تحسین ہے کہ ''ان ترجموں کی اشاعت پر پابندی نہیں''۔ زیرنظر اردو ترجمہ بھی مترجم نے ''فی سبیل اللہ تقسیم'' کیا ہے۔(د - ہ)

مضامین شورش' مرتبہ: پروفیسر محمد اقبال جاوید۔ ناشر: فاتح پبلشرز' یوسف مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۴۰۲۔ قیمت: ۲۵۰ روپے۔

آغا عبدالکریم شورش کاشمیری (م: اکتوبر ۱۹۷۵ء) اسلامیان ہند میں ایک ایسا نام ہے' جسے صحافت' سیاست' خطابت' نثرنگاری اور شاعری کے تذکرے سے خارج کرنا' بھلانا' یا نظرانداز کرنا ممکن نہیں ہے۔

پروفیسر محمد اقبال جاوید (گوجرانوالہ) نے اس عظیم شخصیت کے کلام و بیان کو نہایت خوب صورتی کے ساتھ' نو فصلوں میں مضامین شورش کے صفحات پر اس طرح پیش کیا ہے کہ مطالعے کے بعد قاری کو مطالعہ شورش کی پیاس بے چین کر دیتی ہے۔ پروفیسر محمد منور مرحوم نے بجا فرمایا: ''آغا صاحب جس زور کے نثرنگار تھے' اسی شان کے شاعر بھی تھے۔ ان کی گفتگو اور ان کے قلم کی نگارش میں زیادہ فرق نہیں ہوتا تھا''۔ ابھی سن بلوغت کو نہیں پہنچے تھے کہ انگریز استعمار کے خلاف جدوجہد کی پاداش میں جیل بھیج دیے گئے۔ وہ بتاتے ہیں کہ: ''جیل نے مجھے انسان بھی بنایا اور میری زندگی میں تلخی بھی پیدا کی۔ لکھنا' پڑھنا' بولنا سب کچھ جیل کے اندر سیکھا۔ وہاں میں نے کتابیں کم پڑھیں انسان زیادہ پڑھے''...... (ص ۷۳)

کتاب سے چند جملوں کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے: ''محض کلام اقبال کے مطالعے کا اثر ہے کہ میں کسی حال میں بھی اسلام کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں'' (ص ۱۵۴)۔ ''میں نے کمیونزم پڑھنا شروع کیا' سچ تو یہ ہے کہ میری ذہنی بنیادیں ہل گئیں' عقیدہ ڈانواں ڈول ہوگیا' [تاہم] مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی الجہاد فی الاسلام کا میں نے جیل میں مطالعہ کیا' بے حد متاثر ہوا اور جب قید سے چھوٹا تو میرا ذہن اعتقاداً مسلمان تھا۔ اس کا عظیم سبب مولانا مودودی کی کتابیں تھیں...... [آج] مسلمان نوجوانوں کی اسلامیت کو جو تھوڑا بہت سہارا مل رہا ہے' اس کی بڑی وجہ جماعت اسلامی کا ادب ہے...... مولانا مودودی واحد شخص ہیں جنھوں نے پاکستان کے ذہنی مواد کو عقلی شاہراہ کا پتا بتایا'' (ص ۲۳۶-۲۳۸)۔

شورش کہتے ہیں کہ: ''میرے قلم پر مولانا ابوالکلام آزاد کی چھاپ بہت گہری ہے''۔ اس حوالے سے کتاب کے آخری حصے میں یہ دل چسپ انکشاف ملتا ہے کہ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں مولانا آزاد جامع مسجد دہلی میں تاریخی خطاب کر رہے تھے تو شورش نے لاہور میں بیٹھے ہوئے اپنی چشم تصور سے خود کو دہلی میں موجود پایا اور پھر آزاد کی ایک تقریر خود لکھ کر اپنے اخبار ''آزاد'' میں چھاپ دی۔ اخبار دہلی پہنچا تو بھارت کے محکمہ اطلاعات نے اُسے طبع کر کے تقسیم کرا دیا۔ مولانا آزاد تقریر دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ پتا چلا یہ شورش کی حرکت ہے' محظوظ ہوئے اور کہا: ''یہ خوش گوار معصیت ہے''۔

شورش کاشمیری' شخصی خاکے لکھنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اپنے پیہم رواں قلم اور آبشاروں کی سی روانی سے زندہ اور متحرک لفظوں' تشبیہوں' استعاروں اور مترادفات سے تحریر کو سجاتے اور قاری کے قلب و روح کو سرشار کرتے ہیں۔ اردو نثر کی اس روایت کی وہ آخری کڑی تھے' اور خاتم بھی۔ اب کہاں ایسی تحریر اور کہاں ایسی تحریروں کے قدرشناس۔ پروفیسر اقبال جاوید نے اپنے شوق سے مضامین شورش کو یہ حسن ترتیب عطا کر کے' ایک بڑی خدمت انجام دی ہے۔ (سلیم منصور خالد)

پوشیدہ تری خاک میں' ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی۔ ناشر: دارالتذکیر' رحمٰن مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اُردو بازار' لاہور۔ صفحات: ۲۷۹۔ قیمت: ۱۵۰ روپے۔

اندلس' علامہ اقبالؒ کے خوابوں کی سرزمین ہے۔ ۱۹۳۳ء میں انھوں نے لندن سے واپسی پر میڈرڈ' طلیطلہ' قرطبہ' اشبیلیہ اور غرناطہ کا دورہ کیا۔ مسجد قرطبہ کی زیارت کے بعد' اس پر ایک لافانی نظم لکھی ؎

آب روان کبیر' تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے' کسی اور زمانے کا خواب

علامہ اقبالؒ کے ایک مداح اور شیدائی ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے قرطبہ میں منعقدہ ''اقبال کانفرنس'' (۱۹۹۱ء) میں شرکت کی۔ اس دوران انھیں اندلس کے تاریخی مقامات اور آثار دیکھنے کا موقع ملا۔ پوشیدہ تری خاک میں ...... اسی یادگار سفر کی دل پذیر روداد ہے۔

یہ ایک روایتی سفرنامہ نہیں بلکہ اسلامی تہذیب کے ایک اجڑے ہوئے چمنستان کی داخلی اور خارجی دنیا کا درد بھرا رپورتاژ ہے۔ مطالعے کے دوران قاری کو تاریخ' مشاہدہ اور جذبہ باہم معانقہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس لیے زیرنظر سفرنامے میں نشاط' حسرت اور اُمید کے تینوں رنگ نمایاں ہو کر ہمیں بیک وقت ماضی کی جھلک اور مستقبل کے خواب دکھاتے ہیں۔

کتاب کا اسلوب بیان بلاتکلف اور رواں دواں ہے۔ پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے اس سفرشوق کے دوران شعوری طور پر کسی بھی لمحے کو ضائع نہیں ہونے دیا۔ مشاہدات کے ساتھ، تجزیہ کاری اور باہم گفتگوؤں تک میں اٹھائے جانے والے قیمتی نکات کو قلم بند کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر، پروفیسر محمد منور مرزا مرحوم آخری زمانے میں تقریباً ۱۲، ۱۳ برس تک مرکزیہ مجلس اقبال کے جلسوں سے لاتعلق ہوگئے تھے، جس کا پس منظر خود مرزا صاحب نے بتایا (ص ۱۶۵-۱۶۹)۔ مصنف مسلم اندلس کے اس اجڑے دیار میں مساجد کو دیوانہ وار تلاش کرتے اور قلب کی گہرائیوں میں تڑپتے اور آہیں بھرتے نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''مسیحیوں نے جوش انتقام میں مساجد کو کلیساؤں میں تبدیل کرڈالا...... آہ وہ مساجد، جنھیں دشمنوں نے گرجوں میں بدل دیا، اذان کی جگہ وہاں گھنٹیاں بج رہی ہیں...... [یہاں پر ایک نومسلم ہسپانوی نے بتایا] آپ جتنے چرچ دیکھ رہے ہیں، ابتدا میں یہ سب مساجد تھیں'' (ص ۱۷۱-۱۷۲)۔ ہسپانوی مسیحیوں، اور آج مشرقی یورپ کے قوم پرست عیسائیوں یا بھارت کے جنونی ہندوؤں کو دیکھیں تو ان کے رویوں میں کوئی خاص فرق دکھائی نہیں دیتا۔

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے ادب، تحقیق اور اقبالیات کے سنجیدہ استاد اور اسکالر کی حیثیت سے گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا یہ اقبالیاتی سفرنامہ بھی دل چسپی سے پڑھا جائے گا، ان شاء اللہ!

(س - م - خ)

ادب کہانی ۱۹۹۷ء، ڈاکٹر انور سدید۔ ناشر: مکتبہ فکر و خیال، ۲/۷ اسٹلج بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور۔ قیمت: ۱۹۹ روپے۔ صفحات: ۳۴۴ روپے۔

ڈاکٹر انور سدید نے کئی برس پہلے اُردو زبان وادب کی مختصر تاریخ لکھی تھی۔ اب ادب کا اصناف وار سالانہ جائزہ مرتب کرتے ہیں۔ تحقیق کی نزاکتوں، تنقید کے تقاضوں اور تخلیق کے درد سے بخوبی آگاہ ہیں، کہ وہ خود نہایت اچھے تخلیق کار ہیں۔ جونکتہ انھیں معاصر ادیبوں اور نقادوں سے ممتاز کرتا ہے وہ یہ ہے کہ ادب کے ساتھ ساتھ، قومی وملی اور سیاسی وثقافتی موضوعات پر بھی ان کا قلم یکساں طور پر رواں رہتا ہے۔

ان کی تازہ کتاب ادب کہانی: ۱۹۹۷ء پیش نظر ہے۔ انھوں نے گارساں دتاسی کی روایت کا احیا کیا ہے اور اس روایت کو ایک بہتر اور بلند تر سطح پر لے جاکر اس میں زیادہ معنویت پیدا کی ہے۔

اس جائزے کو نظم اور نثر کے دو بڑے حصوں میں تقسیم کر کے اصناف وار مرتب کیا گیا ہے اور ایک

ایک صنف شعروادب کا کئی لحاظ سے جائزہ لیا گیا ہے، جیسے نظم کے تحت نظم کے عمومی جائزے کے ساتھ جدید نظم کا تجزیاتی مطالعہ، طویل نظم کی روایت، مختصر ترین نظمیں اور غیر ملکی نظموں کے ترجمے۔ بعدازاں دوسری اصناف، جیسے غزل، رباعی، قطعہ، گیت، حمد، نعت وغیرہ، پھر اس کے ساتھ غیر روایتی اصناف کا مختصر تذکرہ۔ اسی طرح نثر کی مختلف اصناف میں افسانہ، انشائیہ، ناول، سفرنامہ، تنقید، طنزومزاح، تحقیق، شخصیت نگاری، خود نوشت، خطوط نویسی وغیرہ کے ساتھ اصناف ادب کے تجزیوں کا تجزیہ، رسائل کے نام خطوط کا جائزہ اور مرحومین کا ذکر وغیرہ---غرض کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہوا۔

سال بھر کے ایک وسیع ذخیرہ ادب کو اتنی تیز رفتاری سے پڑھنا اور پھر کمال مستعدی اور ہنرمندی کے ساتھ اس کا مفصّل اور مبسوط تجزیہ پیش کرنا قابلِ داد ہے۔ بالیقین انور سدید صاحب ادب کہانی کی صورت میں تاریخ ادب کی ایسی مضبوط کڑیاں مرتب کر رہے ہیں جو مستقبل کے ادبی مورخ کے لیے راہ نما ثابت ہوں گی۔ یہ کام ادبی اداروں کے کرنے کا ہے جو فردِ واحد انجام دے رہا ہے۔(ر-ہ)

تعارف کتب

☆ **شیطانی راستے اور بچاؤ کی تدابیر**، مولانا قاری احمد علی محمودی، ناشر: سیدہ خدیجۃ الکبریٰ پبلی کیشنز، جامع مسجد عزیز الہدیٰ، عزیز آباد کالونی، وہاڑی روڈ، حاصل پور، ضلع بہاول پور۔ صفحات: ۲۰۸۔ قیمت: ۸۰ روپے۔[شیطانی خواہشات اور دورِ جدید کے منکرات، فواحش، خبائث از قسم: بدنگاہی، رقص، موسیقی، بسنت، ویلنٹائن ڈے، اپریل فول، بتوں، سود، جوا، شراب، زنا، لواطت، انٹرنیٹ اور ڈش انٹینا وغیرہ کے نقصانات، ان کے بارے میں دینی و شرعی احکام___ ''بچاؤ کی تدابیر'' میں فقط نصیحت و موعظت۔ مگر کیا روکھی پھیکی نصیحت سے مذکورہ بالا بیماریوں کا کارگر علاج ہوگا؟]

☆ **سلطان صلاح الدین ایوبی**، قاضی سراج الدین احمد۔ ناشر: ادارہ مطبوعات خواتین، لاہور۔ صفحات: ۳۴۴۔ قیمت: ۱۴۰ روپے۔[مسئلہ فلسطین کے تناظر میں ایک اہم شخصیت اور بامعنی موضوع پر ایک پرانی کتاب کی اشاعتِ مکرر، مگر افسوس ہے کہ نہ تو فاضل مصنف کا تعارف کرایا گیا اور نہ یہ وضاحت کہ یہ کسی پرانی کتاب کی اشاعت نو ہے۔]

☆ **میرا خدوخیل**، شیریں زادہ خدوخیل۔ ناشر: غالباً خود مصنف۔ پتا: درج نہیں۔ صفحات: ۱۱۸۔ قیمت: ۶۰ روپے۔ [صوبہ سرحد کے علاقہ خدوخیل (ضلع بونیر) کی مختصر تاریخ، تہذیب، ثقافت، معاشرتی روایات، ادب اور ادبی شخصیات کا تذکرہ مع نقشہ۔ ایک اچھی علمی تحقیق کا نمونہ۔ مصنف اس سے پہلے ایک عمدہ کتاب رسول اکرمؐ اور حیوانات شائع کر چکے ہیں۔]

☆ **پاکستان اور عالم اسلام کا بحران اور رسول اللہؐ کی پیشن گوئیاں**، محمد ذکی الدین شرقی۔ ناشر: انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک ریسرچ، ۴۷-اے، بلاک ۱۱، گلشن اقبال، کراچی۔[عالمی طاقتوں کا نیو ورلڈ آرڈر اصل میں مسیح دجال کی حکومت کے قیام کی کوشش ہے۔ ٹی وی، خاندانی منصوبہ بندی، ڈش انٹینا اور سی این این کے ذریعے فتنہ دجال گھروں میں گھس چکا ہے۔ مکہ مدینہ کی حفاظت کے لیے ایک بین الاقوامی اسلامی فوج کی تشکیل کی ضرورت ہے۔]

مدیر کے نام

سید وصی مظہر ندوی ' کینیڈا

ترجمان القرآن میں ''رسائل و مسائل'' (اپریل ۲۰۰۲ء) میں یہ بات: ''یہ (طلاق) جائز کاموں میں سے وہ کام ہے جو اللہ تعالیٰ کو غضب میں لانے والا ہے'' غلط ہے۔ کیونکہ جو کام اللہ کو غضب میں لائے وہ جائز کیسے ہوسکتا ہے' وہ تو حرام ہونا چاہیے۔ حدیث میں اس کو ''ابغض المباحات'' اس لیے کہا گیا ہے کہ تمام مباح صورتوں میں سے یہ صورت سب سے زیادہ ناپسندیدہ ہے۔ مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہے تو طلاق دینے سے اللہ تعالیٰ غضب ناک کیوں ہوگا؟ تنبیہ اور اصلاح کا شرعی راستہ یہی ہے کہ شوہر بیوی کو ایک طلاق دے کر تنبیہ کرے۔ اگر اس پر بھی بیوی کی روش نہ بدلے تو دوسری طلاق دے کر مکمل علیحدگی اختیار کرلے۔ یہ علیحدگی عورت کو معلق رکھنے سے کہیں بہتر ہے۔

کھانا پکانے کے سلسلے میں بیوی کی ذمہ داری کے بارے میں جو موقف بیان کیا گیا ہے وہ بھی محل نظر ہے۔ میری رائے میں کھانا پکانے کی ذمہ داری کے بارے میں اگرچہ کوئی منصوص حکمِ شریعت موجود نہیں ہے' تاہم شریعت کی متعدد تعلیمات اور ہدایات کے مطابق یہ بیوی کی ذمہ داری ہی ہے' مثلاً یہ کہ:

عورت کا دائرہ کار ''گھر'' کو قرار دیا گیا ہے۔ وہ اس دائرہ کار میں رہتے ہوئے اگر کسی معاشی سرگرمی میں حصہ لے سکتی ہو تو یہ جائز ہے' اور اس سے حاصل ہونے والا منافع یقیناً عورت ہی کی مِلک ہے لیکن اپنی گھریلو زندگی سے بے نیاز ہوکر اس کا معاشی تگ ودو میں گم ہو جانا' اسلامی نظامِ معاشرت میں غیر مطلوب ہے۔

عورت کا کھانا پکانا' شوہر کے گھریلو کام میں اس کا ہاتھ بٹانا' بچوں کی دیکھ بھال کرنا ایسے امور ہیں جو ''معروفات'' میں شامل ہیں۔ حتیٰ کہ مغربی معاشرہ باوجود اپنے غیر فطری رجحان کے اس معروف کو مکمل طور پر نہیں کھرچ سکا۔ چنانچہ وہاں پر بھی بیویاں ان ذمہ داریوں کو ادا کرتی ہیں۔ جہاں تک مسلم معاشرے کا تعلق ہے تو دورِ نبوتؐ سے لے کر آج تک یہ مسلم معاشرے کا ''معروف'' ہے جو کسی نص کے خلاف نہیں بلکہ صحابہؓ اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھریلو حالات اس کے شاہد ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ کچھ معاشی فراخی ملنے کے بعد گھریلو خادموں کی فراہمی کے واقعات بھی موجود ہیں لیکن ہر مسلمان گھریلو ملازم تو فراہم نہیں کرسکتا' نہ ہر صحابیؓ کو یہ استطاعت حاصل تھی۔ بے شمار آثار صحابہؓ' اُمت کا صدیوں کا تعامل اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اس معروف کو ثابت کرتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی بیان کرتے ہوئے آپؐ کے تمام چھوٹے بڑے کاموں کا ذکر کیا ہے لیکن کھانا پکانے کا ذکر نہیں کیا' بلکہ گھر

میں آپؐ آتے تو پوچھتے کہ گھر میں کھانے کے لیے کیا ہے؟ دیگر صحابہؓ کے جو گھریلو حالات مذکور ہیں ان میں بھی کھانا پکانے کا کام ان کی ازواج ہی کے ذمے بیان کیا گیا ہے۔

ترجمان القرآن کا موجودہ معیار دیکھ کر بہر حال بہت خوشی اور اطمینان محسوس کرتا ہوں۔ مضامین کا معیار اور تنوع تحریک کے کارکنوں کے لیے بہترین مواد فراہم کرتا ہے۔ اس شمارے میں بشریٰ تسنیم کا مقالہ ''بچوں کی تربیت' ذمہ داریاں اور نزاکتیں'' بہت بلند پایہ اور تحریک کے کارکنوں کے لیے بے حد مفید ہے۔

احمد رضا طار 'ملتان

ورفعنا لك ذكرك اور کلام نبویؐ کی کرنیں (مئی ۲۰۰۲ء) خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں اور ان مضامین کے مصنفین قابل ستایش ہیں۔ ان تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر ہم معاشرے کو صحیح اسلامی خطوط پر استوار کر کے برائیوں سے پاک کر سکتے ہیں۔

محمد عبداللّٰہ 'لاہور

پروفیسر خورشید احمد صاحب نے ''اشارات'' (اپریل ۲۰۰۲ء) میں عالمی حالات کے تناظر میں جس طرح معاشرتی و تہذیبی بحران کی نشان دہی کی ہے وہ حالات و وقت کی ضرورت ہی نہیں بلکہ اُمتِ مسلمہ کے مستقبل اور تشکیلِ کردار کے لیے بھی ناگزیر ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم بحیثیت فرد' قوم اور اُمت موجودہ حالات میں اپنا کردار کس طرح اور کس قدر ادا کر سکتے ہیں؟ اس وقت کے عالمی حالات کے تناظر میں یہ سوال ہم سب کے لیے لمحۂ فکریہ ہے!

نیر آفتاب ' استنبول' ترکی

روزانہ جب میں اپنے کام پر جانے کے لیے گھر سے نکلتا ہوں تو استنبول کی سڑکوں پر یہ منظر روز میری نظروں سے گزرتا ہے۔ بہت سی نوجوان بچیاں اپنے سکول کے باہر گیٹ پر کھڑی ہوتی ہیں۔ اس سخت سردی کے موسم میں یہ بلاناغہ آتی ہیں' جب کہ یہ جانتی ہیں کہ انھیں سکول میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ یہ سب اس لیے ہے کہ انھوں نے حجاب اُوڑھ رکھا ہے' اور وہ اسے ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

یہ بھی معمول ہے کہ اس ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے پولیس آتی ہے' لاٹھیاں برساتی ہے اور کچھ کو پکڑ کر بھی لے جاتی ہے۔ ان بچیوں کے والدین نے اسکول انتظامیہ کے اس اقدام کے خلاف عدالت میں مقدمہ بھی دائر کر رکھا ہے۔ آئیے مل جل کر اس ظلم کے خلاف آواز بلند کریں۔ (مقدمے کی تفصیلات جاننے کے لیے ملاحظہ کیجیے: ویب سائٹ: www.petitiononline.com/hijab01/petition.html)

مجھے خیال آتا ہے کہ کیا یہ وہی استنبول (اسلام بول) ہے جو کبھی خلافت اسلامیہ کا دارالخلافہ تھا اور اگر آج خلافت ہوتی تو ایسا ظالمانہ منظر کبھی دیکھنے میں نہ آتا۔ اس ظلم و ناانصافی کا خاتمہ اسی طرح ممکن ہے کہ ایک بار پھر اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آئے اور عدل و انصاف سے معاملات کو چلایا جاسکے۔

حسین فاروق مودودی نے ملک عبد محمد پرنٹرز سے چھپوا کر ۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور سے شائع کیا

قاضی انٹرپرائزز

محترم ممبران

السلام علیکم ورحمتہ اللہ

بعد ذکر الٰہی عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ایمان اور صحت کی بہترین حالت میں رکھے۔ آپ کے رابطے کا شکریہ۔ ہم ممنون ہیں کہ آپ نے ہم پر اعتماد کیا۔ آپ ہمارے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کے اعتماد پر پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہماری ساکھ کو مزید بہتر کرے۔

ہماری پیش کش کے جواب میں سرمایہ کاری کے لیے جو درخواستیں موصول ہوئی ہیں وہ ہماری توقعات سے کہیں زیادہ ہیں۔ ہمارے لیے ان سب افراد کو پہلے پراجیکٹ میں شامل کرنا ممکن نہیں ہے۔ ہم نے اپنے اشتہار میں بھی اس امر کی وضاحت کر دی تھی کہ قاضی انٹرپرائزز کے ممبران اور تحریکی بھائیوں کو اس اسکیم میں سرمایہ کاری کے لیے ترجیح دی جائے گی اور ممبران 10 حصص تک خرید سکیں گے۔

درخواستوں کی زیادہ تعداد کے پیش نظر ایسا خط امتیاز قائم کرنا ضروری ہو گیا ہے جس کے تحت حصہ داروں کا واضح تعین کیا جا سکے تا کہ سرمایہ کاری کے خواہش مند افراد اور ہمارے ادارہ کے درمیان زیادہ سے زیادہ اعتماد اور تعاون کی فضا موجود رہے۔

ادارے نے فیصلہ کیا ہے کہ مذکورہ اسکیم کے حصص صرف ان افراد کو جاری کیے جائیں جو مندرجہ بالا شرائط پوری کرتے ہیں۔ ایسے افراد ہی یہ حصص خریدیں جو ہماری امانت داری اور دیانت کی ساکھ کو پہلے ہی جانچ پرکھ چکے ہوں اور وہ کسی آزمائش کی ضرورت محسوس نہ کریں۔ فی الحال حصص کی تعداد پوری ہو چکی ہے۔ جیسے ہی کسی پروجیکٹ میں آپ کا نمبر آئے گا آپ کو اطلاع کر دی جائے گی۔ اس سے پہلے رقم بھیجنے کی زحمت نہ فرمائیں۔ شکریہ!

فقط۔۔۔والسلام

محمد ضیاء اللہ قاضی

سیلز ڈائریکٹر

قاضی انٹرپرائزز

رابطہ آفس: 8 جنگ بلڈنگ مری روڈ راولپنڈی۔ فون: 051-5554464 فیکس: 051-5558633

U.A.N : 111-700-300

ویب سائٹ: www.qazi.com.pk ای میل: shaukat@isb.comsats.net.pk